تاریخیت، مباحث و اطلاق: مختار مسعود کی اُردو نثر کا سماجی اور ثقافتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

علی حسن

فیکلٹی آف لینگوئجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جولائی ۲۰۲۱ء

تاریخیت، مباحث و اطلاق: مختار مسعود کی اُردو نثر کا سماجی اور ثقافتی مطالعہ

مقالہ نگار:

علی حسن

یہ مقالہ

ایم فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو یجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

جولائی ۲۰۲۱

مقالے کا دفاع اور منظوری کا کام

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: تاریخیت، مباحث اور اطلاق: مختار مسعود کی اردو نثر کا سماجی اور ثقافتی مطالعہ

پیش کار: علی حسن رجسٹریشن نمبر: 19M/U/S/1734

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان وادب

ڈاکٹر بشریٰ پروین ______________________

نگرانِ مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ______________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈئر سید نادر علی شاہ ______________________

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ ______________

اقرار نامہ

میں علی حسن حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد کی ایم فل اردو اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر بشریٰ پروین کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ ہی آئندہ کروں گا۔

____

علی حسن

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

Abstract:

Mukhtar Masood is a well-known litterateur and Urdu prose writer who has authored four books by elucidating the social and cultural factors of Urdu literature in historical perspective. While writing this research dissertation, the analysis of social and cultural aspects of the Urdu prose writing of Mukhtar Masood has been done by reviewing all of his four books in the light of viewpoints of the historicism. In the first chapter of this study, there is discussion about the introduction of historicism and its perceptions along with the introduction of the Mukhtar Masood. While in second chapter, there is discussion about the political and cultural factors in the writing of the Mukhtar Masood in which analysis has been performed by evaluating the literature upon the modern transformation and socio-cultural factors, even more importantly by categorizing the domestic culture and customs in historical standpoints. In third chapter, there is exploration of social, cultural and literary factors from the writings of the Mukhtar Masood in which there is inclusion of literature from impacts of the Islamic revolution on the socio-economic poster of Pakistan, Aligarh movement and socio-cultural changes. In last chapter of this dissertation, overall analysis, research finding and policy recommendations has been given in which the dissertation has been summed up in the shape of overall analysis. The writings of the author reflect the prevailing and ever changing political dilemma and variations in the mirror of history. The present study is critical and pure research based analysis of writings and prose writing of Mukhtar Masood.

اظہارِ تشکر

الحمد اللہ! مقالہ کی تکمیل پر اللہ رب العزت کا بے حد شکر گزار ہونے کے ساتھ ساتھ رسولِ کریم ﷺ پر بے پناہ عقیدت و احترام کے ساتھ درود و سلام جن کے نظرِ کرم اور اہلِ بیت سے محبت کے صلہ کی بدولت اللہ پاک نے زندگی کے تمام مراحل خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچائے۔ مقالہ کے آغاز سے لے کر اس کے مکمل ہونے تک میرے پیر و مرشد میرے والدین کی دُعائیں میرے لیے شجرِ سایہ دار کی طرح ساتھ ساتھ میرے لیے سود مند رہی، میری فیملی نے میرے تعلیمی سفر کے دوران میری ہر ممکن مدد کی اللہ تعالیٰ میرے والدین اور میری فیملی کا سایہ صحت وسلامتی کے ساتھ قائم و دائم رکھے آمین!

شعبہ اُردو نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈران لینگویجز سے تعلیم حاصل کرنا میرا خواب تھا جو الحمد اللہ، ایم فل کی صورت میں مکمل ہوا جس کے دوران شعبہ کے تمام اساتذہ نے ہر مرحلے پر راہنمائی کرتے ہوئے اس مشکل تحقیقی سفر کو آسان بنایا۔ تمام اساتذہ کرام کا دل سے شکر گزار ہوں۔ بالخصوص میری نگرانِ مقالہ ڈاکٹر بشریٰ پروین صاحبہ کا بے حد ممنون و شکر گزار ہوں جنھوں نے تحقیقی سفر کے دوران میرے ہر سنجیدہ و غیر سنجیدہ سوال کا بخوبی جواب دیتے ہوئے میری ہر مرحلے پر راہنمائی کی۔

میرے دیگر تمام اساتذہ کرام جن سے میں نے اس سے قبل اکتسابِ علم کیا جس میں بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد اور علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد کے اساتذہ بالخصوص ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر ارشد معراج، قاسم یعقوب، ڈاکٹر زاہد حسن چغتائی اور منزہ احتشام گوندل صاحبہ کا بے حد ممنون و شکر گزار ہوں جنھوں نے میری ہر مرحلہ پر راہنمائی کی۔

میرے اس تحقیق سفر کے دوران میرے دوست احباب کی ایک طویل فہرست ہے جو میرا حوصلہ قائم رکھنے کا باعث بنتے رہے اور میرے اس سفر میں آسانیاں پیدا کرتے رہے۔ ان تمام دوستوں کا بھی شکر گزار رہوں گا۔ رب العزت میرے دُنیاوی و اُخروی تمام معاملات بہتر فرماتے ہوئے مجھے دُنیا و آخرت کے تمام مراحل میں کامیاب فرمائے آمین ثم آمین!

مقالہ نگار

علی حسن

باب اوّل: موضوعِ تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

ا۔ موضوع کا تعارف:۔

مجوزہ تحقیقی مقالہ ”تاریخیت، مباحث اور اطلاق: مختار مسعود کی اردو نثر کا سماجی اور ثقافتی مطالعہ“ پر مشتمل ہے۔ مختار مسعود کا شمار اردو ادب کے جدید ادبا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی سوچ کو اپنے فن کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے ادب میں اس طرح سے بیان کیا ہے کہ ان کا تخلیق کردہ ادب ان کے دور میں معاشرتی سطح پر جاری و ساری سیاسی و سماجی اضطراب اور تاریخی منظر نامہ کا آئینہ دار بن کر سامنے آیا ہے۔ مختار مسعود کی تخلیقات نے نہ صرف ان کے دور بلکہ ماضی کی سیاسی و سماجی کشمکش افراد کی معاشرے کے تانوں بانوں میں الجھی نفسیاتی گتھیوں کو بہت خوبی سے پیش کیا۔ مختار مسعود تاریخ کے بیان میں محض تاریخ دان کا فرض ہی نہیں نبھاتے بلکہ اس دور کے نباض کی صورت میں سامنے آتے ہیں، تاریخ کے بیان میں داخلی اور خارجی دونوں پیمانوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ تاریخ کا تجزیہ خارجی سطح کے ساتھ ساتھ داخلی سطح پر وضاحت کے ساتھ مختار مسعود کی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔ مختار مسعود کی کتب میں ”آواز دوست “۱۹۷۳، ”سفر نصیب“۱۹۸۱ ، ”لوحِ ایام“۱۹۹۶ اور ان کی وفات کے بعد ”حرف شوق“۲۰۱۷ میں شائع ہوئی۔ مختار مسعود ایک مورخ کی طرح تاریخی واقعات کو بیان نہیں کرتے بلکہ بطورِ ادیب اس لحاظ سے بیان کرتے ہیں کہ جو ممکنات کا حصہ دکھائی دیتا ہے۔

۲۔ بیانِ مسئلہ:۔

ادیب اپنے عہد کا نباض اور معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ اس سے ادیب اپنے عہد میں ہونے والے واقعات اور سماجی تبدیلیوں کا غیر جانبداری سے مشاہدہ کرتا ہے۔ ادیب مورخ کی طرح محض واقعات کو بیان

نہیں کرتا بلکہ واقعات اور سماجی تبدیلیوں کو ادبی پیرائے میں سامنے لاتا ہے کہ یہ واقعات کسی سماجی تبدیلی کا حصہ ہیں اور ممکنات کا مجموعہ ہے اس طرح ادیب اپنی تحریر میں سماجی و سیاسی تبدیلیوں کا نمائندہ نظر آتا ہے۔ مختار مسعود کی تحریروں میں تاریخیت ایک حساس ادیب اور سماجی دانشور اور سماجی نباض کی صورت میں دیکھنے کو ملتا ہے۔اس لئے ان کی کتب میں تاریخیت اور تاریخی شعور کے تناظر میں سیاسی و سماجی اور عصری تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے تحقیق کی ضرورت ہے۔

۳۔ مقاصد تحقیق:۔

۱۔ تاریخیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنا

۲۔ مختار مسعود کی تحریروں میں تاریخیت کے عناصر کو زیر بحث لانا

۳۔ تاریخیت کے عناصر کی روشنی میں مختار مسعود کی تحریروں کا تاریخی و ادبی مقام واضح کرنا

۴۔ تحقیقی سوالات:

۱۔ تاریخیت ایک جدید مغربی رجحان ہے اردو نثر نگاروں کے ہاں اس کے اثرات کیا ہیں؟

۲۔ مختار مسعود کی تحریروں میں تاریخیت کے عناصر کیا ہیں؟

۳۔ مختار مسعود کی تحریروں میں سیاسی و سماجی شعور کی پیش کش کیا ہے؟

۵۔ نظری دائرہ کار:۔

کسی بھی دور میں ماضی کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں کیا جا سکتا ہر دور، معاشرے اور ہر تہذیب کا انسان ماضی کی بنیاد پر حال کی عمارت کھڑی کرتا آیا ہے اور حال کی عمارت پر مستقبل کی بنیادیں رکھی جاتی رہی ہیں۔ ایسے میں تاریخ کے ذریعے ہم اپنے ماضی میں جھانک کر قوموں کے عروج و زوال کی مکمل

تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ نیز ان اسباب و علل کا جائزہ بھی تاریخ کے ذریعے ہی ممکن ہے جن کی بنا پر ماضی کی عظیم الشان ہستیاں، مطلق العنان بادشاہ اور طاقتور اقوام کو شکست و ریخت کا شکار ہو کر محض تاریخ کے صفحات میں باقی رہ گئیں۔ تاریخ ہی وہ بنیادی کڑی ہے جس کی بدولت انسان کا تاریخی شعور پروان چڑھتا ہے۔ مختار مسعود کے ہاں مختلف تاریخی واقعات کا بیان تہذیب و ثقافت اور عصری آگہی ان کے مخصوص آہنگ میں دکھائی دیتی ہے ان عوامل کا مطالعہ تاریخیت اور تاریخی شعور کے تناظر میں کیا جائے گا۔ڈاکٹر وہاب اشرفی کی کتاب ''مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات'' میں مغربی مفکرین فوکو، باختن التھوسے، ہیڈن وہائٹ، کلی فورڈ کے نظریات کو مد نظر رکھتے ہوئے تاریخیت کو انسانی اعتقادات، تصورات، اخلاقیات کا ایک واضح بیانیہ قرار دیا جاتا ہے اس کا مقصد ثقافتی رابطے کو بھی واضح کرنا ہے۔ان کے بقول تاریخیت وہ فکری رویہ ہے جو تہذیبی شعور، سیاسی و تاریخی شعور، عصری آگہی اور سماجی رویوں سے منسلک تمام متون کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر الطاف انجم کی کتاب ''اردو میں مابعد جدید تنقید'' اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی کتاب ''جدید اور مابعد جدید تنقید'' جو انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کی اس کے علاوہ ڈاکٹر ناہید قمر کی کتاب ''اردو ادب میں تاریخیت'' قابل ذکر ہیں، جن میں تاریخیت کے حوالے سے اور اردو ادب میں تاریخیت کے بارے میں سیر حاصل بحث دکھائی دیتی ہے۔ عصری تاریخی تبدیلیوں سے افراد کی وابستگی تاریخی شعور میں پختگی کا سبب بنتی ہے۔ مختار مسعود جیسا ادیب ان اجتماعی سماجی تبدیلیوں کو دیکھتا ہے تو اس کا اظہار غیر جانبداری سے اپنی تحریروں میں کرتا ہے۔ادیب معاشرے کا مطالعہ ماضی حال کے زیر اثر رہتے ہوئے ان کے سماجی، سیاسی، معاشرتی اور ادبی پہلوؤں کو منظر عام پر لانے کی سعی کرتا ہے۔اس حوالے سے جو اہم کتب زیر مطالعہ رہیں گئیں ان میں ''اردو ادب میں تاریخیت''، ڈاکٹر ناہید قمر، ڈاکٹر وہاب اشرفی کی کتاب ''مابعد جدیدیت''، ''پاکستانی کلچر''، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر نسیم عباس احمر کی ترتیب شدہ کتاب ''نو تاریخیت'' بنیادی کتب کے طور پر زیرِ مطالعہ ہونگی۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار:۔

اس موضوع پر تحقیق کے لئے پہلے سے تحقیق میں رائج دستاویزی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے اور درج ذیل باتوں کو خاص طور پر سامنے رکھا گیا ہے۔

۱۔ ان کی بنیادی کتب تک رسائی حاصل کی گئی ہے۔

۲۔ معاصر ادبی جریدوں میں ان پر شائع ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مضامین سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۳۔ کتب خانوں سے شواہد کی جمع آوری کی گئی ہے۔

۴۔ اس دوران اہم ماہرین سے انٹرویوز کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی آرا کو شامل کیا گیا ہے۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:۔

مختار مسعود پر مختلف نوعیت کے تحقیقی کام کیے گئے ہیں جس میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے " مختار مسعود کی ادبی خدمات" اسی طرح پشاور یونیورسٹی سے احمد حسین خٹک نے " آوازِ دوست کا تنقیدی جائزہ " تحریر کیا۔ مختار مسعود کی نثر میں تاریخی شعور ،سیاسی و سماجی حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ تاریخیت کے تناظر میں مختار مسعود کی نثر کا مطالعہ ماضی، حال اور مستقبل کے رشتے، عصری آگہی، برصغیر کے تناظر میں تاریخی حالات و واقعات کا بیان نئے زاویوں سے مختار مسعود کے تاریخی شعور کو سامنے لانے کا باعث بنتا ہے۔ اس سے قبل مختار مسعود کی نثر میں تاریخیت و تاریخی شعور کے حوالے سے کوئی بھی تحقیقی کام نہیں ہوا۔

۸۔ تحدید:۔

مجوزہ تحقیقی مقالہ "تاریخیت، مباحث اور اطلاق: مختار مسعود کی اردو نثر کا سماجی اور ثقافتی مطالعہ "پر مشتمل ہے۔ اس مقالے میں مختار مسعود کی چار کتب کا انتخاب کیا گیا ہے۔ان تصنیفات میں تاریخی

شعور، تاریخیت کے حوالے سے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا گا۔اس کے ساتھ ساتھ دیگر کتب کا مطالعہ بھی تحقیق میں شامل ہے۔۔

۹۔ پس منظری مطالعہ:۔

موضوعِ تحقیق کی روشنی میں تاریخیت کے حوالے سے شائع ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مضامین و میں تاریخیت و "کُتب کا مطالعہ شامل ہے۔ڈاکٹر وہاب اشرفی کی کتاب "مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات تاریخی شعور کے حوالے سے مغربی روایت اور مباحث کا مطالعہ شامل ہے۔ڈاکٹر الطاف انجم کی کتاب "اردو جو انجمن ترقی اردو پاکستان "اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی کتاب "جدید اور مابعد جدید تنقید"میں مابعد جدید تنقید قابل ذکر ہیں، جن میں تاریخیت" نے شائع کی اس کے علاوہ ڈاکٹر ناہید قمر کی کتاب "اردو ادب میں تاریخیت کے حوالے سے اور اردو ادب میں تاریخیت کے بارے میں سیر حاصل بحث دکھائی دیتی ہے۔ عصری تاریخی تبدیلیوں سے افراد کی وابستگی تاریخی شعور میں پختگی کا سبب بنتی ہے۔ اُردو ادب کے حوالے سے
تاریخیت، تاریخی شعور، سیاسی و سماجی پسِ منظر، تاریخی ادوار کا مطالعہ عصری آگہی اور برصغیر کے حوالے سے شائع ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے علاوہ مختار مسعود کی تحریروں پر شائع ہونے والے تنقیدی مضامین شاملِ مطالعہ ہیں۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت:۔

ادب معاشرے کا عکاس ہوتا ہے ادیب سیاسی و سماجی تبدیلیوں کو اپنی تحریروں کا موضوع بناتا ہے اسی طرح ادیب معاشرے کے حساس طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ عصری تاریخ کو ادب میں بیان کرنا ادیب کا خاصا ہے۔غیر افسانوی تحریروں میں ہمارے ہاں قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی اور ابن انشا جیسے ادبا کی مثالیں ملتی ہیں جو کہ غیر افسانوی تحریروں میں اپنے عہد کی ناہمواریوں اور سیاسی و سماجی تبدیلیوں کو اپنی تحاریر کا

موضوع بناتے ہیں۔اس طرح ہر ادب اپنے عہد کا ترجمان اور عکاس ہوتا ہے اس طرح مختار مسعود کی تحریروں میں ایک مکمل عہد جیتا جاگتا دکھائی دیتا ہے۔ان کی تحریریں تاریخی و ادبی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں۔

ب: تاریخیت، تعارف، مفہوم

اُردو ادب میں مختلف رویوں اور ان کا اظہار، ادب کو پرکھنے، اس کی تفہیم کرنے اور جدید اذہان میں اُٹھنے والے سوالات کے جوابات، علت و معلول کے رشتے، غرض فن پاروں ان کے اثرات اور ماضی، حال و بعد ازاں مستقبل کے لیے ان کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے مختلف ادبی تھیوریاں ہر دور میں سامنے آتی رہی ہیں۔

تاریخیت بھی بنیادی طور پر ایک ادبی تھیوری ہے جس میں تنقیدی رویوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے تاریخ، ادب، تاریخی شعور، سماجی رویوں کا مطالعہ اور ایک وقت، زمانے یا مخصوص دور میں تخلیق کیا گیا ادبی فن پارہ، آنے والے ادوار کے لیے کیا اثرات رکھتا ہے اسی کے ساتھ تاریخ میں ہونے والے سیاسی و سماجی واقعات اور ان کے اثرات کا جائزہ ادبی حوالے سے پرکھنے کا ذریعہ بھی تاریخیت میں زیرِ بحث آتا ہے۔

تاریخیت کی باقاعدہ تعریف اور وضاحت سے قبل تاریخ کا مفہوم اور مطالعہ بھی قدرے اہم و ضروری ہے۔کیونکہ تاریخ کا بیان مورخ کے ہاں الگ معنی رکھتا ہے جبکہ ادیب تاریخ کو ادبی پیرائے میں کس اعتبار سے بیان کرتا ہے یہ اس کے تاریخی شعور پر منحصر ہے۔معاشرتی حالات میں داخل ہونے کے ساتھ ہی تاریخ کا آغاز ہو جاتا ہے۔اسی کے ترقی کرنے پر قومیں اور بعد ازاں مختلف تہذیبیں وجود میں آتی ہیں، نشو و نما پاتی ہیں اور کچھ زوال کا شکار ہوتے ہوتے صفحہ ہستی سے ہی مٹتی چلی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر صادق گِل اپنی کتاب ''فنِ تاریخ نویسی'' میں تاریخ کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ''انسانی معاشرے یا اس کے کسی حصے کے آغاز، ارتقاء، ترقی اور تنزل کے بارے میں معلومات کا علم تاریخ کہلاتا ہے۔ ''[1]

تاریخ مختلف قوموں اور ان کے احوال، ترقی و تنزلی، کامیابی وناکامی، تہذیب وثقافت کے ارتقاء تشکیل اور معاشروں کا متوازن رہنا، قوموں کا عروج وزوال تاریخ کا ایک موضوع سمجھے جاتے ہیں۔ مورخ انہی حالات و واقعات کو جو ماضی میں در پیش آچکے ہوں بیان کرنے کا موجب بنتا ہے۔ جبکہ ان واقعات کے اثرات زبان و ادب اور مختلف فن پاروں، نظریات، انقلابات و دیگر حالات کا جائزہ ایک ادیب ہی اپنے تاریخی شعور کے حوالے سے بیان کرنے کا سبب بنتا ہے۔

تاریخ ایک مکمل عمل کا نام ہے۔ جو تغیر پذیر ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی اقدار، رویوں کے اعتبار سے اپنا عمل جاری و ساری رکھتی ہے۔ تاریخ کے حوالے سے ہی مختلف مفکرین نے جہاں اپنے فکر و فن کے اعتبار سے اپنا اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہے۔ وہاں پر ہی ہیگل جیسا فلسفی تاریخ کے بارے میں رقمطراز ہے کہ:

''تاریخ کا عمل ایک اضدادی عمل ہے جو داخلی و خارجی قوتوں کی کشمکش اور زور آزمائی کے بعد فنا و تغیر کے نئے قالب و روح کے ساتھ جاری ہے۔ یہ عمل فطرت، کائنات، خدا، انسان، روح غرضیکہ کائنات کے ہر ذرے پر جاری ہے۔ انسان اس اضدادی عمل میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے ذریعے خُدا اپنے منصوبوں کو پورا کرتا ہے۔ ''
(۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ ایک تغیر کا نام ہے جو انسانی زندگی کی ایک مکمل تصویر اور تفسیر کہلاتی ہے۔ تاریخ انسانی تجربات، جذبات اور ان کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال کی عکاسی کرتی ہے۔

مختلف طبقات، جدید اذہان، سیاسی و سماجی رویے، ترقی و تنزلی کا اظہار ہمیں تاریخی مطالعے سے ہی پتہ چلتا ہے۔ لہذا تاریخی مطالعے کی اہمیت مسلمہ ہے اور اس سے انکار کسی صورت ممکن نہیں، کیونکہ تاریخ کے مطالعے کی بدولت ہی ہر فن، ہر علم کو بہتر سے بہتر سے بنایا جاسکتا ہے، یا اس کی مزید بہتر راہنمائی کی جاسکتی ہے کہ علم و ادب، تہذیب و ثقافت، اور دیگر علوم میں کیسے بہتری ممکن ہے کیونکہ تاریخ کے مطالعہ سے ماضی، حال اور مستقبل کے رشتے کو مضبوطی فراہم کی جاسکتی ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر مبارک علی، اپنی کتاب ''تاریخ اور سیاست'' میں کہتے ہیں کہ:

''انسان کی سرگرمیوں کو اگر وقت کے اندر سمیٹ لیا جائے تو یہ تاریخ ہے۔ انسان وقت کے دائرہ میں محوِ عمل رہتا ہے۔ اور یہ تاریخی عمل ایک طویل سلسلہ ہے، وقت کے دائرہ میں ہونے والے واقعات زنجیر کی کڑیوں کی مانند ہیں جو برابر طویل ہو رہی ہے۔ لیکن یہ تاریخی عمل اور واقعات کا یہ سلسلہ، اس میں یکسانیت نہیں بلکہ اس میں پیچ و خم بھی ہیں اور نشیب و افراز بھی ''[۳]

ادب اور تاریخ کے باہمی تعلق کو ہر دور میں زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ مختلف مفکرین، ناقدین اور دیگر فلسفیوں نے ادب اور تاریخ کے رشتے کو بیان کرتے ہوئے اپنی اپنی آراء پیش کی ہیں۔ تاریخ کے مخصوص نقطہ نظر کو بیان کرنے کے بعد اب تنقیدی طور پر سامنے آنے والی ادبی تھیوری تاریخیت کا تعارف اور مفہوم بیان کرنا اہم ہے تا کہ تاریخ، تاریخیت اور ادبی حوالے سے ان کا تعلق سامنے آسکے۔

تاریخیت بنیادی طور پر تاریخ سے ہی منسلک ہے یعنی اس کا تعلق تاریخ سے ہی جوڑا جاتا ہے۔ لیکن تاریخیت صرف اور صرف تاریخی واقعات اور ان واقعات کے بیان کرنے کا نام ہی نہیں ہے بلکہ تاریخیت باقاعدہ طور پر تاریخ کا فہم و ادارک ہے، تاریخ کو بیان کرنے، تاریخ کو سمجھنے اور تاریخی اعتبار سے سیاسی و سماجی اور ثقافتی متون کے مطالعے کا نام ہے۔

Historicism is the belief that an adequate understanding of the nature of anything and an adequate assessment of its value are to be gained you considering in its terms of the place it occupied and the role it played within a process of development, [4]

تاریخیت کے تناظر میں صرف تاریخ کا بیان نہیں ہوتا بلکہ تاریخیت میں تاریخ کے اُتار چڑھاو، طبقاتی طور پر ہونے والے عروج و زوال، اس کے اسباب اور ان اسباب کے ساتھ ساتھ ان کا تجزیہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ تاریخیت میں انسانی عقائد، تہذیبی شعور، عصری آگہی اور تاریخی شعور پر مبنی عناصر کو بالخصوص مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ اس میں ثقافتی عناصر کا کردار بھی اہم ہے کہ جن کی بدولت واقعات کا رونما ہونا، ان کے اثرات مثبت اور منفی دونوں اعتبار سے پرکھنا اور ادبی و تنقیدی نقطہ نظر سے ادب اور تاریخ کا گہرا تعلق زیرِ بحث لانا جدید ادبی تھیوری کے اعتبار سے تاریخیت میں دیکھا جاتا ہے۔

تاریخیت میں فن پاروں کو ایک مخصوص نقطہ نظر سے پرکھا جاتا ہے تاریخی حوالے سے ان کی تفہیم کی جاتی ہے داخلی اور خارجی ساخت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تاریخی واقعات کا رونما ہونا ان کے اثرات، تہذیبی اور ثقافتی حوالے سے ان متون کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ مجموعی طور پر تمام سیاسی، سماجی اور ثقافتی دائرہ کار کا احاطہ کیا جاتا ہے۔

ادب اور تاریخ کے تعلق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ادبی مورخین عہد بہ عہد اس عمل کا جائزہ پیش کرتے ہیں، جو تاریخیت کے تناظر میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی و ثقافتی محرکات کا باعث بنتے ہوئے ادب کی سمت متعین بھی کرتے ہیں اور تنقیدی اعتبار سے رونما ہونے والے واقعات ان کا پسِ منظر، ان کے اثرات اور ان اثرات کی منتقلی سے تخلیق ہونے والے ادب کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ واقعات کا تاریخی پسِ منظر، صرف اُس مخصوص عہد میں کتنا کارآمد اور پُراثر تھا بلکہ موجودہ عہد کے اعتبار سے اس کے اثرات، عصری آگہی اور تاریخی شعور بیان کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

اس نقطہ نظر کو بیان کرتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ اپنے مضمون ''تاریخیت و نو تاریخیت'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''ایک سطح پر ادب زمان و مکان سے ورا، ان قدروں کی امانت ہے جو عُرف عام میں دائمی اور آفاقی کہلاتی ہیں۔ جہاں تاریخ زمانے کے تصور کے لحاظ سے مسلسل قدامت کا درجہ اختیار کرتی جاتی ہے، اور ہم مختلف پیمانوں سے اس کی

قدامت کا تعین کرتے رہتے ہیں وہاں ادب ہمیشہ اور ہر دور میں اپنی قدامت اور ماضیت کے باوجود اپنی اخلاقی اور جمالیاتی معنویت کے احساس کو تازہ دم رکھتا ہے۔"(۵)

ان تمام مباحث کو دیکھتے ہوئے تاریخیت متن کو مخصوص نقطہ نظر سے دیکھنے کا نام ہے کہ جس کی بدولت ہر شخص کا تاریخی شعور پروان چڑھتا ہے اور وہ ہر تاریخی واقعہ کو مختلف اور مخصوص نقطہ نظر سے پرکھتا ہے جو تاریخیت کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ تاریخیت کے حوالے سے مختلف عناصر مختلف ناقدین کی آراء اور تنقیدی تھیوری کو بیان کرتے ہوئے سامنے آتے ہیں۔

تاریخیت میں سیاسی و سماجی حالات کا مکمل احوال پیش کیا جاتا ہے۔ متن کو صرف اسی دور کے لئے ضروری نہیں تصور کیا جاتا جس عہد میں وہ تخلیق کیا گیا ہے بلکہ اس کے اثرات آنے والے دور اور بالخصوص ادب کے لیے کتنے دورس ہیں۔ اس کا مطالعہ بھی ثقافتی نقطہ نظر سے بیان کیا جاتا ہے۔

تاریخیت مخصوص فکری انداز ہے جس میں زمانے کے تہذیبی رُجحانات سیاسی و سماجی اور ثقافتی اثرات کو ادب میں دیکھا جاتا ہے۔ ان تبدیلیوں کا اظہار ایک ادیب اپنے فن پارے میں کس انداز سے کرتا ہے۔ اس کا تاریخی شعور ان واقعات کے بیان میں تنقیدی نقطہ نظر سے ان واقعات کے اثرات، سماجی و ثقافتی حوالے سے فن پارے کی قدر و قیمت متعین کرنے کا باعث بھی بنتے ہیں۔ جدید تنقیدی تھیوریز میں تاریخیت کا شمار ہوتا ہے۔ جو تاریخ، ادب، سماجیات کا گہرا تعلق بیان کرنے کا موجب بنتی ہے۔

ج: تاریخیت کی روایت

جدیدیت کے بعد سامنے آنے والے مختلف تنقیدی رویوں اور منظر نامہ میں اُجاگر ہوتے مابعد جدید تصورات میں تاریخیت کا رویہ بھی سامنے آتا ہے۔ مابعد جدید رویوں میں جہاں قاری، فن پارہ، متن اور متن کو مختلف اندازِ فکر سے پرکھنے کا تصور عام ہونے لگا وہاں پر ہی ادبی نقطہ نظر سے تاریخ، ادب اور ان کے باہمی تعلق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے متون کا مطالعہ بھی زیرِ بحث آنے لگا۔

ادب کو تاریخ کی پیداوار، تاریخ کو ادب کی پیداوار ثابت کرنے پر مختلف نقطہ نظر سامنے آتے ہیں جو ایک دوسرے کو مختلف تنقیدی زاویوں سے پرکھتے ہیں، کہ تاریخ ادب کو جنم دیتی ہے یا ادب تاریخ کا زائیدہ ہے۔ متن کی آزادی سے لے کر ادب اور ثقافت کے رشتے کو دیکھتے ہوئے کئی تنقیدی دبستان بھی سامنے آئے۔ جس میں ساختیاتی تنقید کا نام زیادہ نمایاں ہے۔ جس کے اعتبار سے ادب اور ثقافتی روابط اور اس کے زیرِ اثر تخلیق ہونے والا ادب زیرِ مطالعہ آتا ہے۔مابعد جدیدیت کے زیر سایہ تاریخیت اپنا وجود اور نقطہ نظر مخصوص انداز میں سامنے لاتی رہی۔ لیکن یہ بحث بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی کہ تاریخیت ایک باقاعدہ تھیوری تسلیم کی جائے یا نہیں؟

جس کے بارے میں مختلف مفکرین اور ناقدین نے اپنی آراء سے مختلف مدلل تنقیدی مضامین لکھے۔ گرین بلاٹ نے ۱۹۸۷ء میں ایک مضمون لکھا جس میں تاریخیت کے تعلق اور نقطہ نظر کو بطورِ ادبی تھیوری کے واضح کرنے کی کوشش کی۔اس کے علاوہ اُردو زبان و ادب میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے تاریخیت کے ساتھ نئی تاریخیت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

" مابعد جدیدیت جس کی چھتر چھایا میں نئی تاریخیت نے اپنا سفر شروع کیا، کی ایک اہم بلکہ منفرد خصوصیت یہ ہے کہ کسی بھی نظریہ کو حتمی اور واحد متصور نہ کرکے تکثیرت پر اصرار کرتی ہے۔ جس کے طفیل ہر کسی قسم کے نظریے کو پنپنے اور بال و پر پھیلانے کا موقع میسر آیا۔ مختلف اور متنوع نظریات کے ساتھ ساتھ نئی تاریخیت نے بھی اپنا تارو پود تیار کرنا شروع کر دیا۔ ہر چند کہ اس کے موئدین نے اسے تھیوری بنانے کی مخالفت کی لیکن یورپ اور امریکہ میں اس کو ادبی مطالعات میں اس طور سے برتے جانے کی روایت قائم ہوئی کہ ادبی اور ثقافتی منظر نامے پر یہ تھیوری کی صورت نموپذیر ہوئی۔ اور اس طرح آج "نئی تاریخیت" پسِ جدید فکر کی اہم مظہر اور تھیوری ہے "(٦)

تاریخیت جدید تنقیدی مباحث کے ساتھ یورپ اور امریکہ جیسے ممالک میں بطور ادبی و تنقیدی مطالعہ سامنے آتی ہے اس کی باقاعدہ روایت چلتی ہے جس کو ادب، تاریخ، تاریخی شعور اور متن و قاری کے امتزاج کو

بروئے کار لاتے ہوئے تہذیبی و ثقافتی متون کا تنقیدی طور پر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ تاریخیت کا اظہار مختلف مفکرین اور فلسفیوں کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔

تاریخیت کے ابتدائی دور، ابتدائی سفر میں کارل مارکس کے نقطہ نظر، اقوال اور مارکسی سوچ نے اسے متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ جارج ہیگل اور گوئٹے کے مخصوص تنقیدی خیالات تاریخیت کو بطور ادبی اور تنقیدی نقطہ نظر کے اعتبار سے بڑھانے اور پروان چڑھانے میں پیش پیش رہے اور یہ تصور اُبھر کر سامنے آنے لگا کہ تاریخ صرف تاریخی واقعات کا نام ہی نہیں بلکہ تاریخیت، تاریخی متون کے علاوہ دیگر علوم کے ساتھ منسلک ہے اور تاریخی و ادبی فن پاروں کی افہام و تفہیم اور تنقیدی اعتبار سے تجزیاتی طور پر معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔

تاریخیت کے فروغ اور تنقیدی تھیوری کے اعتبار سے اس مخصوص نقطہ نظر کو پروان چڑھانے میں جرمن مفکرین کا کردار بھی اہم اور ناقابلِ فراموش ہے۔ ان مفکرین میں کارل ولیم فریڈرک کا نام لیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخیت دیگر ممالک کے مفکرین مائیکل مونٹی جین، جارج ہیگل، ولیم ڈلتھے اور ہنری رکرٹ کے گراں قدر خیالات اور تصورات کی صورت میں ادب فہمی، تاریخی جستجو، علم و ادب، تہذیب و ثقافت اور سماجی حوالے سے ان کے تعلق کو بیان کرنے کا سبب بنتی ہے۔

جرمن مفکرین کے نزدیک تاریخیت محض تاریخ کا نام اور مطالعہ نہیں اور نہ ہی تاریخیت محض تاریخ تک محدود و محیط ہے، بلکہ تاریخیت سماج، فرد، تخلیق، تاریخی پسِ منظر، ثقافتی عناصر ان کا اظہار ادبی طور پر مجموعی انداز اختیار کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں اور ان کے بنیادی تعلق کی وضاحت کو تاریخیت میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اطاف انجم اس بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

''یہاں پر ایک بات کا اظہار مقصود ہے کہ جب یورپ میں تاریخیت ایک زاویہ نظر کی حیثیت سے متعارف ہوئی تو اس وقت وہاں پر سائنسی رُجحانات کا بول بالا تھا کیونکہ ماضی قریب تک نیوٹن اور دیگر سائنسدانوں کے سائنسی انکشافات اور ایجادات نے ہر شعبہ علم میں سائنس کی عینک لگا کر دیکھنے کے رُجحانات کو تقویت پہنچائی تھی اس دوران ولیم ڈلتھے

اور ہنرخ رکرٹ نے اپنی علم و آگہی کا مظاہرہ کر کے یہ باور کروایا کہ سائنسی اُصول و نظریات کا اطلاق ہر شعبہ علم پر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سائنسی اور سماجی و ثقافتی علوم بالخصوص تاریخ میں مشابہت کے کم اور مغائرت کے زیادہ عناصر موجود ہیں۔ ''(۷)

تاریخ اور سائنسی رُجحانات میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ سائنس قطعیت پر مبنی علم کا نام ہے، جبکہ تاریخ کا مطالعہ ایک تغیر کا نام ہے جو وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں علم و ادب کے ساتھ تغیر و تبدل کا شکار ہوتے ہوئے بدلتے رہتے ہیں۔ سائنسی نقطہ نظر اور طریقہ کار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تاریخیت کے تصور کو سیاسی، سماجی اور ادبی سطح پر فوقیت حاصل ہوئی۔ فکری سطح پر تاریخیت کا تصور مضبوط ہونے لگا۔ تاریخیت کی جڑیں مضبوطی کے ساتھ سماجیات کے ساتھ منسلک ہونے لگیں۔ تاریخیت پر مقالات اور تاریخ و ادب کے رشتے کو تاریخی شعور کے تابع رکھتے ہوئے علمِ تاریخ اور ادب و سماج کے رشتوں کو تاریخیت کے تناظر میں دیکھنے کا رواج عام ہونا شروع ہوا۔ تاریخیت دراصل ادبی مطالعے کا ہی ذریعہ اور نام ہے۔ تاریخی اور سیاسی واقعات، بدلتے سماج اقدار اور سماجی قوتوں کا احاطہ عصری آگہی کے تناظر میں تاریخیت کے زمرے میں کیا جاتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے ادب اور تاریخ کے حوالے سے بنیادی طور پر دو اہم نقطہ نظر زیادہ زیرِ بحث رہے ہیں کہ ادب کا مطالعہ تاریخی اور سماجی حوالے سے ضروری ہے جبکہ ادب کی انفرادیت اور ادب کی خود مختاریت پر بھی دلائل کے ساتھ بحث جاری و ساری رہی۔ ان دونوں رویوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نئی تاریخیت کا رنگ اُجاگر ہوتا گیا جس میں دونوں رویوں کا مطالعہ بیک وقت کیا جاتا ہے یہی فکر مابعد جدیدیت اور پس ساختیاتی نقطہ نظر اور مکتبہ فکر میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

اُردو ادب میں مختلف ناقدین ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر ناصر عباس نیئر، ڈاکٹر الطاف انجم و دیگر نے تاریخیت اور نئی تاریخیت کے حوالے سے نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے اس کا تعلق تاریخ کے ساتھ نہ صرف جوڑا ہے بلکہ ادب اور تاریخ کے ساتھ ساتھ کسی عہد میں تخلیق کیا گیا فن پارہ، مصنف اور اس کا تاریخی شعور ، رویہ اورآراء تاریخیت کے تناظر میں تخلیق کے اندر دکھائی دیتا

ہے۔ تاریخی متون کا مطالعہ سیاسی ، سماجی، ثقافتی اعتبار سے مختلف مفاہیم و معنی دیتا ہے۔ اسی وجہ سے اس نقطہ نظر سے ان متون کا مطالعہ ہر عہد ہر دور کے تناظر میں کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایسے تخلیق شدہ فن پارے جو تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہوں ان کا مطالعہ ، تجزیہ عصری حوالے سے کرنا تاریخیت اور نئی تاریخیت کے مطالعے میں شمار ہوتا ہے جس سے ان متون کا سیاسی، ثقافتی تہذیبی اور سماجی پہلو نہ صرف اُجاگر ہوتا ہے بلکہ ان کا تجزیہ حال میں رہتے ہوئے موجودہ نظام، علم و ادب، تہذیب و ثقافت اور عصری رویوں سے بخوبی کیا جاتا ہے یہی ادب کا حُسن اور مکالمے کا ذریعہ ہے جس کی افادیت تاریخی، ادبی اعتبار سے مسلمہ ہے۔

نئی تاریخیت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر وہاب اشرفی لکھتے ہیں کہ:

" نئی تاریخیت کے مطابق ادب اور تاریخ میں اٹوٹ رشتہ ہے اس لئے تاریخ محض علم کا کوئی خزانہ نہیں ہے بلکہ اسے ادبی متن کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ گویا ادب تاریخ کی نمائندگی کا ایک ذریعہ ہے جس میں بصرتیں تاریخ کے عوامل کے ساتھ پیش ہوتی ہیں گویا ادب ہی تاریخ میں تبدیلی کا باعث ہے۔ ادب کے متون تاریخ کے واقعات پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ سیاسی، سماجی معاملات میں نیز عقائد کے سلسلے میں بھی۔ گویا تاریخی مطالعہ ادبی مطالعہ بھی ہے اور جس طرح کسی ادب کے متن کا جائزہ لیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح تاریخ کے متن کا بھی۔"[۸]

مفکرین کی اجتماعی فکر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ادب کا مطالعہ محض یک رُخی نہیں کیا جا سکتا بلکہ ادب کا مطالعہ تاریخی تناظر کے ساتھ ساتھ اس دور کے سیاسی، سماجی ثقافتی اور عصری تقاضوں، رویوں اور متون کے رشتوں کے مطابق کیا جا سکتا ہے۔ ادب میں ایک ساتھ کئی رویے کارفرما ہوتے ہیں جو تہذیبی و ثقافتی عناصر کی تشکیل کے ساتھ باقاعدہ ایک عہد کی تاریخ جنم دینے میں مدومعاون ثابت ہوتے ہیں۔

فوکو کے خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے تاریخیت کے یہ عناصر سامنے آتے ہیں کہ فن پارے کے ساتھ ساتھ مصنف کا تاریخی شعور، ادب اور تاریخ کا باہمی ربط و رشتہ، سماجیات تہذیب و ثقافت اور عصری تناظر میں مختلف زاویوں کو ہر عہد میں سامنے لانے کا باعث بنتا ہے۔ جس میں اقتصادی عناصر بھی کارفرما ہوتے ہیں اور تہذیب و ثقافت کا کردار تاریخی اعتبار سے فن پارے اور مصنف کی ذہنی سطح پر نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔

اُردو ادب میں تاریخیت کے تناظر میں مختلف اصناف اور فن پاروں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔مابعد جدید فکر میں تاریخیت کا کردار اُردو زبان و ادب میں نئے فکری و تنقیدی زاویوں کو سامنے لانے کا باعث بنتا ہے۔۱۸۵۷ء کے بعد کی صورتحال اور نو آبادیاتی کلونیل ازم سے لے کر مختلف سیاسی، سماجی سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں کا احوال تاریخیت کے ذیل میں اُردو ادب میں پیش کیا جاتا ہے۔تاریخیت تاریخ ادب اور فرد کے باہمی تعلق کو داخلی اور خارجی سطح پر بیان کرنے کا سبب بنتی ہے۔اسی کے زیر سایہ سیاسی شعور سماجی شعور اور تاریخی شعور مختلف فن پاروں میں دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔

ادیب چونکہ اپنے عہد کا نباض ہوتا ہے، ان کے تخلیق شدہ فن پاروں میں زبان وادب کی جمالیاتی خوبیوں کے ساتھ ساتھ تنقیدی اور فکری سطح پر تہذیب و ثقافت اور تاریخی شعور کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

اس تمام صورتحال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُردو ادب میں تاریخی حوالے سے ایسے کئی فن پارے تخلیق ہو چکے ہیں جن میں عصری عقائد، ماضی کے حالات و واقعات، نو آبادیاتی نظام اور ان کے اثرات ادب اور تاریخ کا تعلق تہذیبی و ثقافتی عوامل کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں۔اسی وجہ سے تاریخیت کے بنیادی عناصر میں تاریخی شعور، تہذیبی شعور، ثقافتی، سیاسی و عصری آگہی زیادہ نمایاں اور واضح ہیں۔ان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہی مختلف ادبی متون کا احاطہ اور مطالعہ تاریخیت کے ذیل میں کیا جاتا ہے۔

اُردو ادب میں بالخصوص نثر میں ناول نگاری کے فن سے تاریخ اور تاریخیت کا تعلق براہ راست دکھائی دیتا ہے جہاں پر ''آگ کا دریا'' سے لے کر مابعد نو آبادیاتی فکر کے تحت تاریخی سیاسی عوامل پر مبنی کئی ناول اور افسانے سامنے آچکے ہیں۔جن میں تاریخیت کے عناصر پائے جاتے ہیں اور ان کا مطالعہ اردو ادب میں تاریخیت کے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ انتظار حُسین کے ناول ''بستی'' میں تقسیم اور ہجرت سے متعلق تاریخی حوالے سے سیاسی و سماجی صورتحال کا تذکرہ ملتا ہے۔

احسن فاروقی کا ناول، خدیجہ مستور کا ناول اور عبداللہ حُسین کے ناول بھی اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں جن کی بدولت تاریخیت اور ان کے عناصر کا اثر اُردو زبان و ادب میں فروغ پاتا ہے۔ڈاکٹر انوار سجاد کا ناول ''خوشیوں کا باغ'' بانو قدسیہ کا ناول ''راجہ گدھ''، جمیلہ ہاشمی کا ناول '' دشتِ سوس''، مستنصر حُسین تارڑ کا ناول ''بہاو'' شمس الرحمن فاروقی کا ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں''، مرزا اطہر بیگ کا ناول ''غلام باغ''، اور ایسے کئی فن پارے اور دیگر اصناف سیاسی، علامتی، تاریخی اور تہذیبی عوامل کے ساتھ منسلک رہتے ہوئے تاریخیت اور اس کے بنیادی عناصر کو سامنے لانے کا باعث بنتے ہیں۔

غیر افسانوی نثر میں تاریخیت کا احاطہ اور بالخصوص موضوعِ تحقیق کی مناسبت سے مختار مسعود کی کُتب کا احاطہ و مطالعہ تاریخیت اور تاریخیت کے عناصر کے ذیل میں بہت اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ مختار مسعود جیسا صاحبِ طرز ادیب، حساس طبع کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے فن کو محض تاریخ گوئی تک محدود نہیں رکھتے بلکہ ان کی تخلیقات میں ان کا تاریخی شعور نمایاں ہے۔

مختار مسعود کے ہاں تاریخ کا بیان تاریخیت کے ذیل میں سیاسی، سماجی اور بالخصوص ثقافتی سطح پر بہت واضح دکھائی دیتا ہے۔مابعد جدید فکر اور تاریخیت کا بنیادی فریضہ بھی تاریخ کے ساتھ ساتھ ادبی نقطہ نظر سے ادب تاریخ، سماجیات، تہذیب و ثقافت کے باہمی تعلق اور رشتے کو ایک ادیب اور فن پارے کی صورت میں بیان کرنے کا باعث بنتا ہے۔مختار مسعود کی نثر کا مطالعہ تاریخیت کے تناظر اور ان سے منسلک بنیادی مباحث اور عناصر کو مدنظر رکھتے ہوئے، مختار مسعود کی فکر اور ان کا تاریخی شعور بیان کرنے سے قبل مختار مسعود کا بطورِ قلم کار و ادیب تعارف ضروری ہے۔

د۔ مختار مسعود کا تعارف

مختار مسعود ۱۵، دسمبر ۱۹۲۶ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ عطااللہ درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ تھے جو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں استاد کی حیثیت سے اپنے فرائض سر انجام دیتے رہے۔مختار

مسعود کے والد ماہرِ معاشیات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہوئے علمی و ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ والدین کی تعلیم و تربیت اور گھریلو ادبی ماحول کی بدولت یہ رنگ مختار مسعود کی شخصیت میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

تعلیم و تربیت کے سلسلے میں مختار مسعود بھی علی گڑھ ہی منتقل ہوئے جہاں انھوں نے اکتسابِ علم کے مراحل طے کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں اپنا نام بنایا۔ ڈاکٹر الطاف یوسف زئی اپنی کتاب ''مختار مسعود کا اسلوب''میں لکھتے ہیں کہ:

''مختار مسعود کی تعلیم اور تربیت برصغیر پاک و ہند کی اس وقت کی بڑی درس گاہ علی گڑھ یونی ورسٹی میں ہوئی۔ مختار مسعود عام طالب علم نہیں تھے۔ آپ نے تعلیم، کھیل اور ہم نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سوشل مسائل پر مباحثوں میں حصہ لیا اور کئی انعامات حاصل کیے۔ ان کے تعلیمی کیریر پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ علمی میدان میں ذہین اور قابل طالب علم تھے اُنھوں نے ۱۹۴۲ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ایف۔ اے کا امتحان ۱۹۴۴ء میں دیا اور بورڈ بھر میں پانچویں پوزیشن حاصل کی۔''(۰۹)

مختار مسعود زمانہ طالب علمی سے مختلف طلباء تنظیموں سے وابستہ رہے اور اپنی بلند سوچ سے آزادی کی جدوجہد میں اپنا مثبت کردار ادا کرتے رہے۔ مختار مسعود نے زیادہ تر تعلیم مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے حاصل کی اور علی گڑھ سے عقیدت و محبت کے اثرات ان کی شخصیت اور ان کی مختلف تحریروں میں جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت علی گڑھ میں ان کی تعلیم جاری تھی جو ایک سال بعد پایہ تکمیل کو پہنچنے کے بعد عملی سطح پر پاکستان واپسی پر مزید اُبھرنے لگی، جس کی جستجو اور عملی تصویر کے لیے مختار مسعود نے مقابلے کا امتحان دیا اور کم عمر سول سروس کا اعزاز بھی اپنے نام کرتے ہوئے کامیابی حاصل کی۔

مختار مسعود باقاعدہ طور پر سول سروس میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ان کو کئی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر کام کرنے کا موقع ملا وہ اسسٹنٹ کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور کمشنر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مینار پاکستان کے لئے بنائے جانے والی کمیٹی کے سربراہ کی حیثیت سے بھی کام

سر انجام دیتے رہے جب وہ کمشنر لاہور کے عہدے پر موجود تھے۔ مختار مسعود ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء تک آر-سی-ڈی کے سیکرٹری کے طور پر کام کرتے رہے۔اسی دوران انقلابِ ایران اُنھوں نے براہ راست دیکھا، ایران کی اس بدلتی صورتحال اور انقلاب کا مکمل منظر نامہ اُنھوں نے اپنی کتاب ''لوح ایام'' میں بھرپور انداز سے قلمبند کیا ہے۔

سرکاری منصب کے ساتھ ساتھ فکری جہات اور ان کی تسکین ان کے گہرے مشاہدے اور کئی ممالک میں بطور سرکاری آفیسر کام کرنے کے مواقع سے پایہ تکمیل تک پہنچتی رہی۔ادبی حوالے سے مختار مسعود کے دور میں اُردو کے مشہور ادیب اور حکمت سے وابستہ ، حکیم محمد سعید ''شام ہمدرد'' کے نام سے ادبی نشت کا اہتمام کرتے تھے جہاں دیگر علماء، ادباء شرکت فرمایا کرتے تھے۔وہاں سے ہی مختار مسعود کی ادبی شخصیت کا رنگ اُجاگر ہوتا ہے۔مختار مسعود نے باقاعدہ طور پر ''شامِ ہمدرد'' کے پلیٹ فارم سے اپنے مضامین پڑھنے کا آغاز کیا۔جس کے بعد ادبی حلقوں میں ان کی بہت پذیرائی ملی۔

مختار مسعود کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

۱۔''آوازِ دوست'' جنوری ۱۹۷۳ء

۲۔''سفر نصیب ''جنوری ۱۹۸۰ء

۳۔ان کی وفات کے بعد'' حرف شوق'' ۲۰۱۷ء میں شائع ہوئی

اس کے علاوہ مختار مسعود کی دو کُتب انگریزی زبان میں بھی شائع ہو چکی ہیں جو درج ذیل ہیں

Eye Witness of History

An Appraisal of Conal Resourse in West Pakistan

یعنی مغربی پاکستان کی سرزمین کا جائزہ کے عنوان سے سامنے آچکی ہے۔اس کے علاوہ مختار مسعود نے افسانہ نگاری اور اس فن سے بھی وابستگی اختیار کی لیکن یہ افسانے باقاعدہ کسی کتابی صورت میں سامنے نہیں آسکے البتہ نقوش جیسے معیاری رسائل میں یہ افسانے شائع ہوتے رہے۔

مختار مسعود کو اُردو ادب میں ''آوازِ دوست'' کے حوالے سے بہت شہرت حاصل ہوئی۔اس کتاب کے درجنوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں یہ کتاب دو اہم مضامین پر مبنی ہے۔ جس کے اسلوب کے بارے میں اُردو ادب سے وابستہ ہر قاری تعریفی کلمات ادا کرنے کے ساتھ اس سحر میں مبتلاء دکھائی دیتا ہے۔اس کتاب میں مختار مسعود ایک آٹو گراف البم اپنے دستِ ہنر مند میں رکھے دکھائی دیے ہیں جو مختلف اشخاص کے دست خط حاصل کرنا چاہتے ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر قمر عباس رقمطراز ہیں کہ:

''کہانی کچھ یوں ہے کہ ۱۹۳۸ء میں ایک کم سِن طالب علم نے آٹو گراف البم اس غرض سے خریدی کہ اُس کے عالم باپ سے ملنے ایک چینی عالم اُس کے گھر آنے والا ہے اور باپ نے حکم دیا ہے کہ اُس چینی عالم کے آٹو گراف حاصل کیے جائیں۔یوں اب وہ آٹو گراف البم اُس طالب علم کی ساتھی ہے اور اُسے یہ حق ہے کہ وہ اپنی پسندیدہ شخصیت کے دست خط کو اُس آٹو گراف البم کی زینت بنائے۔ چناں چہ چینی عالم سے اس سلسلے کا آغاز ہوا۔سال ۱۹۳۹ء تھا۔برصغیر آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں تھا سیاسی محاذ جنگ پر سب سے زیادہ بے چینی تھی۔ ''[۱۰]

مختار مسعود بالخصوص اپنی مخصوص فکر اور اسلوب کے حوالے سے اُردو ادب میں صاحبِ طرز نثر نگار ہیں۔جن کا اندازِ بیان منفرد اور دلکش ہے۔جو انہیں اُردو کے بڑے نثر نگاروں میں لا کھڑا کرتا ہے۔الفاظ کی نشت و برخاست پر خاصی توجہ اور عبور حاصل ہے جو قارئین کی دلچسپی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے تاریخی حوالوں کو عمدگی سے بیان کرنے اور پرونے کا ہنر رکھتے ہیں۔

مختار مسعود نے تہذیب و ثقافت کے حوالے سے اپنی تحریروں کو تاریخی دستاویز کا درجہ دیتے ہوئے بہت اہم واقعات پر اپنا تاریخی شعور نہ صرف بیان کیا بلکہ ان واقعات سے متاثر ہوتے ہوئے انہیں اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔ مختار مسعود کی تحریریں ان کی اعلیٰ سرکاری منصبی کے باوجود بطورِ ادیب ،بطورِ تاریخ دان، غیر

جانبداری کا دامن پکڑتے ہوئے اپنی فکر کے ساتھ بیان کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ جن سے ان کی تحریروں کی اہمیت تاریخی تناظر میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اُردو زبان و ادب کے صاحبِ طرز اسلوب نگار، نثر نگار مختار مسعود کا انتقال ۱۵، اپریل ۲۰۱۷ء کو لاہور میں ہوا۔ ان کی عمر ۹۱ برس تھی۔ سوگوران میں دو بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہے۔ ۲۰۰۳ء میں ان کی خدمات کو مد نظر رکھتے ہوئے قومی سطح پر سراہا گیا اور انہیں حکومتِ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی جانب سے ستارہ امتیاز سے نوازا گیا۔

ہ۔ مختار مسعود کا تاریخی شعور

تاریخ کا فہم، ادارک، تجزیہ اور اس کے اثرات بنیادی طور پر تاریخی شعور کو پروان چڑھاتے ہیں۔ تاریخ کا تعلق تغیر پذیری کے ساتھ ہے جو لمحہ بہ لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ تاریخ کے بدلتے ہوئے ادوار، واقعات و علمی و ادبی رُجحانات ماضی، حال اور مستقبل کے تعلق کو پرکھنا تاریخی شعور کے زمرے میں آتا ہے۔ ماضی کے واقعات ان کے دورس اثرات اور ان کی قدر و منزلت جن کی وجہ سے کون سے نظریات قبولیت حاصل کرتے ہیں کون سے عوامل انسانی زندگی اس کے علوم و فنون کو متاثر کرنے کا باعث بنتے ہیں بلکہ رویہ، رُجحان اور مختلف تحریکات کا سبب بنتے ہیں ان کا ایک شخص، ایک ادیب و مصنف کیسے تجزیہ کرتا ہے انہیں اپنی تحریروں میں کس حوالے سے بیان کرتا ہے ادیب کا فکری آہنگ تاریخ کے حوالے سے کیا ہے؟ تاریخی شعور ہی کی بدولت سامنے آتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی ''تاریخی شعور'' کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

''تاریخ کو اس نقطہ نظر سے پڑھنا ضروری ہے کہ واقعات و افکار کے تجزیہ میں طبقاتی گروہی مفادات کو دیکھا جائے۔ ایک مرتبہ جب تاریخی شعور اس قدر پختہ ہو جائے کہ وہ دوسرے کے سماجی، سیاسی اور معاشی عمل میں طبقاتی مفادات کی نشان دہی کر سکے تو پھر نہ صرف ماضی کو بہتر سمجھا جا سکتا ہے بلکہ حال و مستقبل کے بارے میں بھی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔''(۱۱)

تاریخی شعور کی بدولت ماضی کے واقعات ان کے اثرات اور بالخصوص علمی و ادبی حوالے سے مختلف تبدیلیوں کا احاطہ بلند تاریخی شعور کی وجہ سے بخوبی لگایا جاتا ہے۔مابعد جدید فکر میں فن پارے کے ساتھ ساتھ مصنف کی ذہنی استعداد کا مطالعہ بھی زیرِ موضوع ہے۔چونکہ ہر لکھاری، ادیب اپنے سماج کا عکس ہوتا ہے اور زمانے کے گہرے مشاہدے سے اپنی علمی و ادبی استعداد کو بروئے کار لاتے ہوئے فن پارہ تخلیق کرتا ہے جس سے ناصرف تاریخی شعور بڑھتا ہے بلکہ تاریخ کا فہم اور واقعات کی منتقلی اور تجزیہ بروقت ممکن ہے۔

مختار مسعود کی چاروں کُتب اور تحریروں میں تاریخی شعور دکھائی دیتا ہے۔ سرکاری منصب پر رہتے ہوئے کئی واقعات کے چشم دید گواہ بھی ہیں اور کئی انقلابات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ان کو اپنے الفاظ میں پرویا۔ ''آوازِ دوست'' سے لے کر ''حرفِ شوق'' تک ان کا اندازِ بیان تاریخی شعور کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

معاشرے کے سیاسی و سماجی حالات کا تذکرہ، تاریخی شعور کی عکاسی کرتا ہے۔ ''آوازِ دوست'' کے دونوں مضامین تحریک پاکستان سے قیامِ پاکستان تک ہمارے تاریخی ورثے کی منظر کشی اور نمائندگی کرتے ہیں۔ مختار مسعود اپنے تاریخی شعور کی بدولت اس علمی و ادبی اور بالخصوص تاریخی ورثے کی منتقلی کا باعث دکھائی دیتے ہیں جہاں وہ جگہ جگہ تاریخ کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ہماری آنے والی نسل اس تاریخی ورثے سے مستفید ہونے کے ساتھ مختار مسعود کے تاریخی شعور سے بھی متاثر ہوگی۔

''آوازِ دوست'' میں مختار مسعود تاریخی شعور کی عکاسی کچھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ:

''اس برِ عظیم میں عالمگیری مسجد کے میناروں کے بعد جو پہلا اہم مینار مکمل ہوا وہ مینارِ قراردادِ پاکستان ہے۔ یوں تو مسجد اور مینار آمنے سامنے ہیں لیکن ان کے درمیان یہ ذرا سی مسافت جس میں سکھوں کا گردوارہ اور فرنگیوں کا پڑاؤ شامل ہیں تین صدیوں پر محیط ہے۔ میں اس مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا ان تین گمشدہ صدیوں کا ماتم کر رہا تھا۔ مسجد کے مینار نے جھک کر میرے کان میں راز کی بات کہہ دی، جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہو جائیں جہاد کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے، ملک کے بجائے مفاد اور ملت کے بجائے مصلحت عزیز ہو، اور جب مسلمانوں کو موت سے خوف آئے زندگی سے محبت ہو جائے، تو صدیاں یوں ہی گم ہو جاتی ہیں۔''[۱۲]

مختار مسعود کا تاریخی شعور ایسے کئی اقتباسات میں دکھائی دیتا ہے جو ''آوازِ دوست'' سے لے کر ''حرفِ شوق'' تک ایک طویل تاریخی و فکری سلسلہ ہے۔ تاریخی شعور بنیادی طور پر تاریخ کے بدلتے ہوئے ادوار، واقعات اور تغیر پذیری کے ساتھ ہے لہذا مختار مسعود واقعات کے بیان کرنے ان کا تجزیہ پیش کرنے اور ادبی حوالے سے اپنے طرزِ ادا سے قارئین کے لئے مختلف مشاہدات، تجربات اور تاریخی دستاویز کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

تاریخی شعور کا تعلق ادبی حوالے سے ماضی میں ادب اور تاریخ کے باہمی روابط اور ایک طرف لمحہ موجود میں اس کی قدر و قیمت کی تعین کرنا بھی ہے۔ مختار مسعود نے اپنے تاریخی شعور کے حوالے سے ماضی کے ماحول اور آج کے معاشرے کو، ان کے باہمی تعلقات کو علمی و ادبی حوالے سے منسلک کیا ہے۔ تاریخی شعور کی بدولت فکری سطح پر نئے نئے مباحث نظریات کو سامنے لانے کا موقع میسر آتا ہے۔

مختلف تحریکات، انقلابات اور تبدیلیوں کا احاطہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تاریخی شعور میں پختگی ہو گی۔ دیگر معاشروں کا، سماج کا، علم و ادب، تہذیب و ثقافت کا مطالعہ اسی صورت ممکن ہے جب تاریخی شعور بلند اور توانا ہو گا۔ مختار مسعود کی کُتب، ان کی تحریروں اور ان کے طرزِ بیان، اسلوب کو اسی وجہ سے اُردو ادب میں سراہا جاتا ہے کہ ان تحریریں بنیادی طور تاریخی حوالوں سے بھرپور ہیں۔

مختار مسعود کا تاریخی شعور ان کے الفاظ کا چناؤ اور واقعات کا بیان اور تجزیہ ماضی حال اور مستقبل کے رشتوں کو منظم انداز میں بیان کرتا ہے۔ ڈاکٹر روف پاریکھ مختار مسعود کے تاریخی شعور کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''لوحِ ایام'' میں مختار مسعود کی دیگر کتابوں کی طرح تاریخی شعور بھی ہے۔ احساس قومی بھی، ملتِ اسلامیہ کا درد بھی۔ یہ کتاب اُردو میں انقلابِ ایران کے اہم مآخذات میں یوں شامل ہے کہ یہ ایک درد مند اور دیانت دار چشم دید گواہ کا بیان ہے۔ جسے اپنی قومی اور تاریخی ذمے داریوں کا بھی شعور ہے اور تاریخ کو بنتا دیکھنے کی اہمیت کا احساس بھی۔''[۱۳]

مختار مسعود نے اپنے تاریخی شعور کی بدولت اپنی تحریروں میں مختلف سیاسی حالات کا تذکرہ، ان کا تجربہ پیش کرنے کے ساتھ مختلف تاریخی شخصیات کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان شخصیات کے ساتھ ایک مکمل تاریخی پسِ منظر وابستہ ہے، جس کو بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے مخصوص لب و لہجہ میں مختار مسعود نے بیان کیا ہے۔

فکر و نظر میں وسعت اور گہرائی ان کی تحریروں اور واقعات کے بیان سے بخوبی دیکھی جاتی ہے۔ ''آوازِ دوست'' میں کئی تاریخی شخصیات کے آٹوگراف لینے سے لے کر تاریخ کے سفر میں ان شخصیات کے کردار پر اپنا تاریخی شعور بروئے کار لاتے ہوئے بھرپور تجزیہ اور تاریخ کا فہم ان کی نثر میں موجود ہے۔ انقلاب ایران کا قصہ ان کی کتاب ''لوحِ ایام'' میں اس طرح قلمبند ہے کہ ہر تاریخ کا طالب علم اس سے نہ صرف مستفید ہوتا ہے بلکہ مختار مسعود کے تاریخی شعور کو محسوس کرتے ہوئے تاریخ سے علمی و ادبی سطح پر واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

حوالہ جات (باب اول)

۱۔صادق علی گِل،ڈاکٹر، فن تاریخ نویسی، ایمپوریم پبلیشرز، اُردو بازار لاہور،۱۹۹۸، صفحہ ۳۰،

۲۔صادق علی گِل،ڈاکٹر فن تاریخ نویسی، ایمپوریم پبلیشرز، اُردو بازار لاہور،۱۹۹۸ء، صفحہ ۱۷،

۳۔مبارک علی،ڈاکٹر، تاریخ اور سیاست، تاریخ پبلیکشرز، مزنگ روڈ لاہور،۲۰۱۶ء، صفحہ ۴۲،

4. Encyclopedia of Philosophy, Vol 3 and Vol4, New York Macmillan, page# 24, 1978

۵۔نسیم عباس احمر،ڈاکٹر، نو تاریخیت (منتخب اُردو مقالات)، مثال پبلشرز، فیصل آباد،۲۰۱۸ء، صفحہ ۵۹،

۶۔ناصر عباس نیر،ڈاکٹر، جدید اور مابعد جدید تنقید، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی،۲۰۰۴ء، صفحہ ۲۴۵،

۷۔الطاف انجم،ڈاکٹر، اُردو میں مابعد جدید تنقید، عکس پبلیشرر، لاہور،۲۰۱۸ء، صفحہ ۱۴۳،

۸۔وہاب اشرفی،ڈاکٹر، مابعد جدیدت مضمرات و ممکنات، پورب اکادمی، اسلام آباد،۲۰۰۷ء، صفحہ ۱۲۳

۹۔الطاف یوسف زئی،ڈاکٹر، مختار مسعود کا اسلوب، مثال پبلشرر، فیصل آباد، اشاعتِ سوم ۲۰۱۹ء، صفحہ نمبر ۱۳،۱۲

۱۰۔قمر عباس،ڈاکٹر، آوازِ دوست اور مختار مسعود (سنڈے میگزین)، روزنامہ جنگ، راولپنڈی،۲۶ ،اگست ۲۰۱۸ء

۱۱۔مبارک علی،ڈاکٹر، تاریخ اور سیاست، تاریخ پبلیکشرز، مزنگ روڈ، لاہور،۲۰۱۶ء، صفحہ ۳۴،

۱۲۔مختار مسعود، آوازِ دوست، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار، لاہور،۲۰۱۶ء (چالیسواں ایڈیشن)، صفحہ ۴۰،

۱۳۔ روف پاریکھ، ڈاکٹر، لوحِ ایام پر نقشِ آوازِ دوست کا سفر نصیب ہوا، روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۹، اپریل ۲۰۱۷ء

باب دوم

مختار مسعود کی تحریروں میں سیاسی و تہذیبی عناصر

مختار مسعود کی تحریریں سیاسی و تہذیبی منظر نامہ کے لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں۔ جہاں ان کی شخصیت علمی و ادبی حوالے سے قد آور ہے وہاں پر ہی ان کی تحریریں تاریخی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے دورس نتائج کی حامل ہیں۔ بر صغیر کی سیاسی و سماجی صورتحال کے پیش نظر وجود میں آنے والے تخلیقی ادب، اپنے اندر مختلف مفاہیم و معنی رکھتا ہے۔ ہر تخلیق کار اس منظر نامے کو اپنی بساط اور تاریخ کی عینک لگا کر قلمبند کرتا ہے۔

مختار مسعود کے شخصی خاکے کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان کی تحریروں کا مطالعہ عصری تقاضوں، سیاسی ابتری، نو آبادیاتی نظام کی بھاگ دوڑ، مسلمانوں کا طرزِ عمل اور فطرتی ردِ عمل، مذہب کا سہارا، علمی و ادبی فضاء یقیناً ایک تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ جس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے بر صغیر کی عوام اور بالخصوص مسلمانوں نے سیاسی حوالے سے اپنے الگ نصب العین کو متعارف کروایا اور اس کی تکمیل کے لیے جدوجہد کو آزادی کے حصول تک جاری رکھا۔

تحریکِ علی گڑھ کے مخصوص آہنگ، نقطہ نظر اور اپنی فکری جہات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے قاری کو منظر نامے تک رسائی ان کی تحریریں اور بالخصوص ان کی شہرہ آفاق پہلی کتاب ''آوازِ دوست'' جو پہلی بار ۱۹۷۳ء جنوری، میں شائع ہو کر ادبی منظر نامے کا حصہ بنی۔ زندہ نثری اسلوب کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی حوالے سے ایک مکمل تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ جس میں بر صغیر کے سیاسی و سماجی احوال و آثار مختار مسعود کی علمی و سیاسی بصرت کی غماز، الگ نقطہ نظر اور اندازِ فکر کی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔

کتاب ''آوازِ دوست'' تاریخ کا وہ منظر نامہ ہے جس منظر نامہ میں علی گڑھ اور علی گڑھ سے منسلک قد آور شخصیات (علمی و ادبی) کا تذکرہ ایک مخصوص فکر کی ترجمانی کا باعث بنتا ہے جس مکتبہ فکر نے ادب، سیاست سماج اور بر صغیر کی سیاسی و تہذیبی عناصر و عوامل کی نشو و نما میں اہم کردار ادا کیا۔

مختار مسعود کا منصب، فکر، حُب وطنی، تاریخی میلان اور سماجی ربط انہیں منفرد اسلوب کی رعنائیوں، رویوں، رُجحانات، داخلی و خارجی حالات کے غیر جانبدارانہ بیان پر مجبور کرتا ہے۔ اسی لیے ان کی پہلی تصنیف "آوازِ دوست" شائع ہوتے ہی اُردو ادب میں وہ اہمیت اختیار کر گئی جو دیگر مورخین، ناقدین اور ادب سے وابستہ قارئین کے لیے تاریخی، سیاسی اور تہذیبی مطالعہ کا باعث بنتا ہے۔

ا۔ آوازِ دوست

مختار مسعود کی پہلی کتاب "آوازِ دوست" کے نام سے جنوری ۱۹۷۳ء کو منظرِ عام پر آئی، انتہائی مختصر دیباچے کی حامل اس کتاب کا عنوان مولانا روم کی ایک نظم سے ماخوذ ہے جس کے لفظی معنی مانوس اور دل کش آواز لیے جاتے ہیں۔ مختار مسعود نے مختصر دیباچہ کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں شامل مضامین کی نوعیت بھی بیان کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ: "اس کتاب میں صرف دو مضمون ہیں۔ ایک طویل مختصر دُوسرا طویل تر۔ ان دونوں مضامین میں فکرِ فردا اور خُون کا رشتہ ہے۔ فکر سے مُراد فکرِ فردا ہے اور خون سے خونِ تمنا"[۱]

آوازِ دوست دو اہم اور تاریخی نوعیت کے مضامین پر مبنی کتاب ہے۔ ادیب اور اس کے تخلیق کردہ فن پاروں کا اپنے عہد کا ترجمان ہونا فطری عمل اور بنیادی لازمہ ہے۔ ادیب مختلف مدارج و مراحل سے ہوتا ہوا اپنے سماج اور تاریخی شعور کی بدولت حالات کا تذکرہ کرتا ہے۔ مختار مسعود بھی ان دونوں مضامین "مینارِ پاکستان" اور "قحط الرجال" میں ذاتی تجربات، سماجی و تاریخی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے ماضی، حال اور مستقبل سے اپنی تحریروں اور یاداشتوں کو ہم آہنگ کرتے ہیں۔

خشک مغز و خشک تار و خشک پوست

از کجامی آید این آوازِ دوست

ترجمہ: لکڑی، تار، اندرون، سب کچھ تو اس ساز کا بے جان ہے۔ پھر دوست کی سی آواز اس میں کہاں سے آتی ہے؟

اُن کی کتاب ''آوازِ دوست'' عصری تقاضوں سے گزرتے ہوئے تاریخی واقعات کا غیر جانبداری سے تجزیہ اور معاشرے میں تبدیلی، سرکاری اداروں کے قیام، تاریخی، علمی و ثقافتی ورثے کی دیکھ بھال، تشکیل، ماہیت اور مختلف طبقات کی ذہنی و فکری تسلسل کا بیان ہے۔ جو مکمل طور پر تاریخی و عصری تقاضوں کی عکاسی کرتے ہوئے ان دو مضامین کی صورت میں سامنے لائی گئی ہے۔ جن کو پڑھنے کے بعد برصغیر کے سیاسی و سماجی حالات کا احوال سامنے آتا ہے یہاں کے رہنے والے طبقات کا شعور، تقسیمِ ہند، تاریخی واقعات ان کے اثرات (مثبت و منفی)، نظام کا تسلسل سیاسی حوالے سے اور مختار مسعود کا تجزیاتی و تاریخی جائزہ عصری آگہی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

الف: عصری آگہی

مختار مسعود نے اپنے عصر میں رہتے ہوئے ماضی کے واقعات کا مرقع جس انداز میں کھینچا ہے وہ تاریخی و سماجی اعتبار سے ایک مکمل عہد کی عکاسی کرتا ہے۔ ہر تخلیق کار اپنے گرد و بیش کے حالات و واقعات اور عصر سے متاثر ہوتا ہے بلکہ اس کی تخلیقات میں عہد کی ترجمانی بھی مخصوص انداز میں موجود ہوتی ہے۔

مختار مسعود کے دونوں مضامین جو ان کی کتاب ''آوازِ دوست'' میں شامل ہیں عصری آگہی کے آئینہ دار ہیں۔ ''مینارِ پاکستان'' کے عنوان سے موجود مضمون میں مختار مسعود کئی ذمہ داریوں اور فرائضِ منصبی کے ہمراہ سماج، معاشرے کو اپنے تخلیقی آہنگ اور تاریخی شعور کے سانچے میں پرکھتے ہوئے کئی اہم تاریخی و سیاسی شخصیات کا تذکرہ کرتے ہیں بلکہ معاشرے کے سیاسی و سماجی حالات کا ذکر کرتے ہوئے برصغیر کی اور تقسیمِ ہند و بعد کی صورتحال مخصوص لب و لہجہ میں قارئین تک پہنچانے کا باعث بنتے ہیں۔

مختار مسعود ''آوازِ دوست'' کے ابتدائی صفحات میں تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ اعلیٰ سرکاری عہدوں میں تعینات رہنے کے ساتھ ساتھ ''مینارِ پاکستان'' کو تعمیر کرنے کے لیے بنائی جانے والی کمیٹی کا بھی اہم حصہ رہے۔ اس دوران یہاں کے مخصوص کلچر و سوچ کے مطابق یہ رویہ سامنے آیا کہ برتری و فاتح ہونے کا ثبوت باقاعدہ طور

پر بلند و بانگ میناروں کی تعمیر و تشکیل کے ساتھ پورے عالم میں رعب کی علامت سمجھی جاتی ہے لہٰذا اسی طرز پر مینار تعمیر کیا جائے۔ ڈاکٹر ابو الاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں کہ:

''مسلمان اس برصغیر میں فاتح کی حیثیت سے آئے۔ فاتحین کے مذہب اسلام اور ان کی زبانیں عربی، فارسی اور ترکی تھیں۔ ان کا اپنا علمی، ادبی اور تہذیبی ورثہ تھا۔ ادھر ہندوستان کی مقامی ہندو تہذیب بھی بڑی گھمبیر تہذیب تھی۔ لیکن مسلمانوں اور بالخصوص فارسی بولنے والے مسلمانوں نے یہاں کی تہذیب پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ چنانچہ برصغیر پر مسلمانوں کی حکومت اور مسلم تہذیب و ثقافت کے اثرات سے ایک نیا کلچر وجود میں آگیا جسے ہند لسانی کلچر کہا جاتا ہے۔''[۲]

تاریخیت کے بنیادی عناصر میں کسی تخلیق اور فن پارے میں عصر کا احاطہ کرنا اہمیت کا حامل و بنیادی نوعیت رکھتا ہے۔ مخصوص کلچر کی نمایندگی، سماج اور تقسیمِ ہند کے بعد کی صورتحال کو مقامی سیاسی و بعد از سیاسی استحکام کے حوالے سے مختار مسعود نے اپنی فکر کو اس مضمون کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے برصغیر کی موجودہ صورتحال اور عصری آگہی کو بروئے کار لاتے ہوئے بطورِ چشم دید گواہ کی حیثیت سے قلمبند کیا ہے۔ جو ایک مسلمہ تاریخی دستاویز کی صورت میں ''آوازِ دوست'' کا حصہ بن چکا ہے۔

کتاب ''آوازِ دوست'' میں وہ مینارِ پاکستان کی تعمیر کے حوالے سے رقمطراز ہوتے ہوئے اس کا تعلق اہرامِ مصر اور دیگر میناروں سے بھی منسلک کرتے ہیں۔ مختار مسعود کا تاریخی شعور، عصری آگہی کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے بڑے پُر تاثیر انداز میں مینارِ پاکستان کے قیام اور اس کے لیے یادگار کا لفظ حذف کرتے ہوئے مینار کا لفظ محض اسی لیے استعمال کیا گیا کہ مختار مسعود عصری آگہی رکھنے کی بدولت اس بات اور حقیقت کو باور کروانے میں کامیاب رہے کہ یادگار کا لفظ فنا ہونے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جبکہ یہاں پاکستان کے قیام اور تاریخی اعتبار سے مسلمانوں کے تشخص کی بات ہے لہٰذا یادگار کی جگہ مینارِ پاکستان کا لفظ متفقہ طور پر مستعمل ہوا۔ عصری تقاضوں اور عصری آگہی کی بدولت ہی مختار مسعود ''آوازِ دوست'' میں لکھتے ہیں کہ:

''تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مینار کی ابتدائی صورت دفاعی ضرورت کے تحت وجود میں آئی، پھر اس کی علامتی حیثیت قائم ہوئی اس کے بعد یہ دین کا ستون بنا اور آخر کار نشان خیر کے طور بنایا جانے لگا۔ مینارِ قراردادِ ان ساری حیثیتوں پر محیط ہے۔ یہ نظریاتی دفاع کی ضرورت، تحریکِ آزادی کی علامت دین کی سر فرازی کا گواہ اور ہماری تاریخ کا ایک نشانِ خیر ہے۔''(۳)

سیاسی اعتبار سے مینارِ پاکستان انتہائی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ جس کی اہمیت اور عصری آگہی کو دیکھتے ہوئے اُنھوں نے اس کے لیے تیار کردہ اور قائم کی گئی کمیٹی میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ تاریخی اعتبار سے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس کی حیثیت کو مسلمہ قرار دیتے ہوئے مکمل تاریخی پسِ منظر بیان کرتے ہوئے اس کو تحریکِ آزادی کی علامت کہا دین کی بلندی اور ہمارے سیاسی سفر کی جدوجہد، کوششوں، قربانیوں کا پیش خیمہ قرار دیا۔ یہی وجہ سے کہ پاکستان کے وجود و قیام کے لیے پیش کی گئی قراردادِ پاکستان کی منظوری سے لے کر قیامِ پاکستان کی منزل اور آج تک مسلم قوم کے لیے مینارِ پاکستان ایک مکمل تہذیبی، سیاسی اور تاریخی ورثے کی علامت ہے۔

تاریخی اعتبار سے اُنھوں نے کئی دوسرے میناروں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی تاریخی اہمیت سے روشناس کروایا ہے۔ یہ مینار مذہبی ورثے کے حامل بھی ہیں اور قوموں کی پہچان کا ذریعہ بھی، کیونکہ ان میناروں کی نسبت سے قوموں کی سیاسی جدوجہد وابستہ ہے اور بہت سے ممالک کے لیے تاریخی و تہذیبی ورثے کی حیثیت ہے۔

اُنھوں نے اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں کئی ممالک کے انقلابات، سیاسی عروج وزوال اور مثبت و منفی تبدیلیوں کو اپنی چشمِ نظر سے نہ صرف دیکھا بلکہ عصری تقاضوں اور عصری آگہی کی بدولت اپنی تحریروں کا حصہ بھی بنایا ان کی یہ تحریریں نہ صرف ایک علمی و ادبی سرمایہ ہے بلکہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت سے کئی ملکوں، کئی تہذیبوں اور کئی معاشروں کی عملی تصویر کشی کا بہترین نمونہ ثابت ہوتی ہے۔ مختار مسعود لکھتے ہیں کہ:

''مجلسِ تعمیر کے ایک رکن قدیم تعمیرات کے ماہر ہیں۔ ایک دن ان سے گفتگو ہوئی تو کئی عقدے کھلے اور کتنی گرہیں مضبوط ہوتی چلی گئیں۔ دُنیائے اسلام کا سب سے پُرانا مینار جو آج بھی موجود ہے مسجدِ بنو اُمیہ کا مینار ہے۔ ایک دن دمشق کے ایک بازار میں پھر رہا تھا جس پر خمدار ٹین کی چادروں کی چھت ایسے پڑی ہوئی تھی جیسے ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم ہو۔ ایک جگہ سے دو چادریں غائب تھیں اور اس حصے سے سورج بھی جھانک رہا تھا اور ایک مینار کی رفعت بھی۔ میں نے اس مینار کی ایک تصویر بنائی اسے دیکھتا ہوں تو خود حیرت کی تصویر بن جاتا ہوں۔ مسجد بنو اُمیہ کا یہ شمالی مینار آج پورے تیراہ سو دو سال قبل بنا تھا۔ یہ ہمارے میناروں کا امام ہے۔ اس کے پیچھے لاتعداد مینار دست بستہ کھڑے ہیں، ایک نیا مقتدی ابھی آخری صف میں آن کر شامل ہوا ہے، اسے مینارِ قراردادِ پاکستان کہتے ہیں۔''(۴)

''آوازِ دوست'' میں مختار مسعود میناروں کے تذکرہ اور بالخصوص مینارِ پاکستان کے حوالے سے تاریخی پہلوؤں سے روشنائی فراہم کرتے ہوئے اپنے تاریخی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کا تعلق باقاعدہ طور پر رویے، رُجحان، اور تحریک کی صورت میں بیان کرتے ہیں یہ ان کی عصری آگہی کا پیش خیمہ ہے کہ مینارِ پاکستان کے قیام اور ماضی کی سختیوں، انگریزوں کی آمد اور برصغیر میں سیاسی انحطاط کو منظر نامہ بخوبی پیش کرتے ہیں۔

برصغیر میں تاریخی اعتبار سے مختار مسعود مینارِ قراردادِ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے اسے موجودہ صورتحال اور ماضی حال اور مستقبل کے مضبوط رشتے سے جوڑتے ہوئے عصری آگہی کو بیان کرتے ہیں کہ یہ سلسلہ صدیوں پر محیط ہے جس کو محض ایک مینار کی تشکیل سمجھ کر فراموش کر دیا جاتا ہے۔ درحقیقت جب رویوں میں تبدیلیاں واقع ہو جائیں، حالات اس نہج پر چلے جائیں جہاں مذہب محض عبادت گاہوں تک محدود ہو جائے اور اس کی تشریح ہر شخص اپنے فہم کے مطابق کرنا شروع کر دے، جذبہ جہاد اور جنگ و جدل میں دو طرفہ فرق ختم ہو جائے تو دین کی سرفرازی اور ملت و قوم کے تصور میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ جو ان کے مذہبی و تہذیبی ورثے کے ساتھ ساتھ تاریخی اعتبار سے دوررس نتائج کے حامل حالات کو پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

برصغیر کی سیاسی صورتحال، انگریزوں کی آمد، نو آبادیاتی نظام کی بھاگ دوڑ، مسلمانوں کا طرزِ عمل، آزادی کی جدوجہد، بعد از آزادی انتظامی معاملات اور عوامی مسائل کا فوری حل سیاسی قیادت کے لیے اولین مسئلہ تھا جس

کے پائیدار حل کے لیے اتحاد، امن اور یگانگت و یکجہتی کی ضرورت درپیش تھی۔ ان تمام معاملات کو مختار مسعود نے ''آوازِ دوست'' میں موجود مضمون ''مینارِ پاکستان'' میں بیان کیا ہے۔ تاریخی حوالے سے ہی محض اشارے نہیں کیے گئے بلکہ مسلمانوں کو اپنے اسلاف، ان کے حالات، ان کے کارناموں اور موجودہ صورتحال میں ہماری ذمہ داریوں کو یاد دلایا گیا ہے۔ مختار مسعود بیان کرتے ہیں کہ:

''یہ 1857ء ہے، سنگِ میل پر خونِ ناحق کے چھینٹے ہیں، سماں بے نور ہے، کچھ نظر نہیں آتا۔ خستہ جانوں کا ایک قافلہ ہے جس میں غالب خستہ بھی شامل ہے۔ غالب ہندو کا مقروض ہے، انگریز کو پنشن کی عرضی دیتا ہے مگر اس کا جواب ہی نہیں آچکتا۔ لال قلعے کی آخری شمع اب خاموش ہو چکی ہے۔ کسی کو سوچنے کا بھی یارا نہیں۔ سنگِ میل سے سید احمد ٹیک لگائے کھڑے کچھ لکھ رہے ہیں، سر سید بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر کو کہہ رہے ہیں کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا اشتراک کسی صورت میں ممکن نہیں رہا۔''(۵)

عصری آگہی ہی کی بدولت مختار مسعود نے ان تاریخی پہلوؤں کو بیان کرتے ہوئے مسلم کمیونٹی و مسلم قوم کو ذہنی و فکری طور ایک نئی راہ اور تحریک دینے کی کوشش کی ہے۔ خود احتسابی، علم و ادب، سیاسی و سماجی معاملات، تاریخی استدلال، جدوجہد قربانیوں کی لازوال داستان مختار مسعود کی زبانی عہدِ حاضر تک ایک مکمل تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ جس سے تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان تک کے سفر کی علمی و ادبی اور فکری داستان نہ صرف سمجھ آتی ہے بلکہ ایک بیوروکریٹ، ادیب کی حیثیت سے مختلف سرکاری عہدوں اور محکموں پر فائز ہونے کے باوجود غیر جانبداری اور تاریخی شعور کی بدولت عصری تقاضوں اور عصری آگہی کی ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اسے اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔

اُردو ادب میں مختار مسعود کی کتاب ''آوازِ دوست'' اس حوالے سے اہم تصور کی جاتی ہے کہ یہ ایک مکمل تاریخی دستاویز اور پاکستان کے قیام کی جدوجہد کی عظیم داستان ہے جس میں آنکھوں دیکھا حال اور نوآبادیاتی نظام، اس کی بھاگ دوڑ اور اس کے دورس اثرات و نتائج اور تحریکِ پاکستان کے دوران کی جانے والی مشترکہ کوششوں کو جدید آہنگ میں بیان کیا گیا ہے۔

عظمتِ رفتہ اور عہدِ حاضر کے تعلق کو مربوط کرتے ہوئے انھوں نے ایک سیاسی و سماجی منظر نامہ تشکیل دیا ہے جس میں اُنھوں نے اسلوب کی دل کشی اور الفاظ کے موقع محل اور حالات کے گرد و پیش پر مبنی الفاظ کی نشت و برخاست کا لحاظ رکھتے ہوئے خونِ تمنا اور خونِ جگر دونوں کے ملاپ کا عملی مظاہرہ کیا ہے۔ جس کو پڑھ کر مختار مسعود کی عصری آگہی اور عہدِ حاضر کے تقاضوں اور توقعات کو پرکھا جاسکتا ہے کہ پاکستان کا قیام کس محنت کا شاقہ ہے۔

ڈاکٹر روف پاریکھ مختار مسعود کے مضمون ''مینارِ پاکستان'' اور عصری آگہی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ:

''اس کا پہلا مضمون ''مینارِ پاکستان'' اس قومی نشانِ عظمت کے توسط سے تحریکِ پاکستان کے وہ گوشے روشن کرتا ہے، جس پر تاریخ کی کتابوں میں روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن ہم پاکستانیوں نے اُنہیں محبت کی سنہری روشنی میں نہیں دیکھا۔ مختار مسعود اس مضمون میں وہ جادوئی قندیل لے کے کھڑے ہیں، جس کی سنہری روشنی میں پاکستان اور اس کی بنیادوں میں محفوظ صدیوں کا قیمتی تاریخی ورثہ جگمگا رہا ہے۔ کاش ہماری نئی نسل اور نام نہاد پڑھے لکھے سیاست دان بھی اسے پڑھ لیں۔''(۶)

ڈاکٹر روف پاریکھ کے بقول مختار مسعود نے اس مضمون میں ہمیں سوچنے سمجھنے کے نئے راستے اور زاویے مہیا کیے ہیں۔ ہمیں اپنے عصر میں رہتے ہوئے عصری آگہی کو بروئے کار لاتے ہوئے ان تمام حقیقی اور تاریخی ادوار کو پرکھنا ہوگا جس پر آج یہ عمارت قائم کی گئی ہے اس کا بیان اور ان حقائق کا بیان مختار مسعود ے اپنی کتاب ''آوازِ دوست'' اور اپنے مضمون ''مینارِ پاکستان'' میں بیان کیا ہے، جس کو پڑھنے، سمجھنے اور موجودہ عہد میں اس ورثے سے مستفید ہونے کے لیے ہر طبقہ اور ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے مستقبل کے لیے اپنی راہیں متعین کرسکتے ہیں۔ مختار مسعود رقم طراز ہیں کہ:

''جس ذہنیت نے مینارِ پاکستان کی بنیادیں کھودی تھیں وہ اب اس کی تعمیر اور سرفرازی میں ہمارا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ ہندوؤں نے اپنی اکثریت، سرمایہ، تجارت، تعلیم، عہدے اور اخبار سبھی مخالفت میں جھونک دیئے۔ ہمارے

پاس اس سارے ہنگامے میں صرف ایک آواز تھی، ایک نحیف انسان کی گرجدار آواز۔ اس نے کہا، پاکستان قضائے الٰہی ہے اور ہندوؤں کا کوئی جوش یا واویلا اسے آگے پیچھے نہیں کر سکتا۔ مخالفت کا ایک دوسرا رُخ بھی تھا۔ گورا فرنگی رُخ جو کبھی حیرت سے سفید اور کبھی غصے سے سُرخ ہو جاتا تھا۔"(۷)

یہ عوامل تاریخ کی کتابوں کا حصہ ہیں ان تاریخی عوامل کی روشنی میں اقوام ترقی کے زینے طے کرتی ہیں۔ ماضی سے قومیں سیکھتی ہیں اور حال میں انہی عمل پیہم کی صورت میں نافذ العمل کرتے ہوئے مستقبل کے لیے اپنی جدوجہد کو کامل یقین کی بدولت ترقی و کامیابی کا ذریعہ بناتی ہیں۔ ان تمام عوامل کو مختار مسعود نے اپنے مضمون "مینارِ پاکستان" میں بیان کیا ہے، جس سے ایک نقشہ ایک مرحلہ وار جدوجہد کی داستان سامنے آتی ہے کہ یہ جدوجہد پاکستان کے وجود کا حصہ ہے۔ جس پر آج ایک آزاد اور خود مختار مملکت کا قیام ممکن ہوا اور اس کی حفاظت اور تعمیر و ترقی کا خواب ابھی شرمندہ تعبیر ہونا باقی ہے۔

مختار مسعود کے ہاں عصری آگہی ان کے تاریخی شعور اور مشاہدات کی بدولت ان کی تحریروں میں دکھائی دیتی ہے۔ ہر ادیب اپنے عہد کا ترجمان اور عکاس ہوتا ہے وہ ماضی، حال اور مستقبل کے رشتے کو منسلک کرتے ہوئے اپنی فہم کو قاری تک منتقل کرتا ہے۔ مختار مسعود اس حوالے سے صاحبِ اسلوب و صاحبِ طرز نثر نگار کہلاتے ہیں کہ ان کے اسلوب میں وہ رنگ موجود ہے جو تاریخ کے مشکل بیان کو الفاظ کا پر تاثیر جامہ پہناتے ہوئے اسے قارئین تک باآسانی منتقل کرتے ہیں اور عصرِ حاصر کے لیے اسے معنویت عطا کرتے ہیں۔ مختار مسعود کی تحریروں میں سیاسی حالات و واقعات کا بیان بھی پُر تاثیر انداز میں جُذیات نگاری کے فن کو بُروئے کار لاتے ہوئے بڑے منظم انداز میں بیان کیا گیا ہے اور ان سیاسی و تاریخی حالات و واقعات کو تحریکِ پاکستان سے قیامِ پاکستان تک کے عرصے کے لیے ایک مکمل دستاویز کی شکل دی گئی ہے۔

ب: سیاسی و سماجی حالات کا مطالعہ

مختار مسعود کی نثر جہاں ادبی حوالے سے اہمیت کی حامل ہے وہاں ان کی تحریروں میں سیاسی و سماجی حالات کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ یہ حالات مختار مسعود کی زبانی ان کی کتاب ''آوازِ دوست'' کے علاوہ دیگر کُتب کے اندر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ نو آبادیاتی نظام، جبری طور پر مسلط ہونے والا نظامِ حکومت، دو قومی نظریہ اس کے معاشرے پر اثرات، برصغیر کا سیاسی شعور، عوام کی شمولیت اور راہنماوں کا اپنی عوام کو تحریک کی صورت میں یکجا کرنا اور مشترکہ سیاسی جدوجہد میں قائدین کا ساتھ دینا ان کی تحریروں کا خاصا ہے۔ شاملِ کتاب دونوں مضامین ان سیاسی و سماجی حالات کا پرتو ہے جس کی بنیاد پر مختار مسعود نے اپنے تاریخی شعور کی عمارت استوار کرتے ہوئے اسے اپنی تحریروں کا منظم حصہ بنایا ہے۔

مینارِ پاکستان کے قیام اور اس کے لیے قائم کردہ کمیٹی میں شامل ہونے کے ناطے مختار مسعود نے اس کی سیاسی اہمیت، تاریخی پسِ منظر اور میناروں کے قیام ان کے مقاصد ان کی سیاسی حیثیت اور قومی تشخص کی علامت قرار دیتے ہوئے اسے سیاسی بالا دستی اور پختہ ارادوں سے مشابہ قرار دیا ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد، برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ نظام کی کمزوری، مذہب اور مذہبی اقدار سے دوری، مشکلات سے نبرد آزما ہونا اور مختلف سیاسی و سماجی راہنماوں کا طرزِ عمل ان کی تحریروں کا حصہ ہیں۔

مختار مسعود نے اپنے شاملِ کتاب مضمون ''مینارِ پاکستان'' میں جہاں میناروں اور بالخصوص مینارِ قراردادِ پاکستان کا مکمل احوال بیان کیا ہے وہاں ان کے دوسرے اہم مضمون قحط الرجال میں مختلف علمی و ادبی سیاسی شخصیات کا ذکر اور ان کے اقوال برصغیر و عالمی سیاسی تناظر میں ان کا تذکرہ شامل کیا ہے۔

مختار مسعود نے سیاسی حوالے سے تحریک علی گڑھ اور مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت سے سیاسی جدوجہد کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے باہمی اشتراکات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ درست اور موزوں طور پر نصب ہونے والا پتھر یوں تو ایک کالج کا سنگِ بنیاد تھا مگر جس روز یہ نصب ہوا گویا اس روز مینارِ پاکستان کی بنیادیں بھی بھری گئیں۔ سید محمد نے جو سپاسنامہ پڑھا اس میں لکھا تھا کہ یہ ملک بھر میں پہلا ادارہ ہے جو مسلمان ایک علیحدہ طبقے کی حیثیت سے اپنی انفرادی ضرورت اور متحدہ خواہش کے تحت قائم کر رہے ہیں اور اس مدرسے کی بنیادیں تاریخ کے ان تقاضوں میں ملیں گی جن سے یہ ملک پہلے کبھی دوچار نہیں ہو۔''(۸)

برصغیر میں قیام پذیر اقوام میں دو قومی نظریہ کی آواز گونجنے لگی اور الگ وطن کا تصور شدت کے ساتھ اُبھرنے لگا۔ تاریخ اس جدوجہد کی گواہ ہے جس کو تقویت اور راستہ علی گڑھ نے عطا کیا۔ ہندوں کی جانب سے اس تحریک اور اس کے مقاصد پر کئی قسم کے سوالات بھی اُٹھائے گئے اور اس کو ایک منظم سازش کا عکس قرار دیا گیا۔ کبھی زبان کے حوالے سے اعتراضات اُٹھائے جانے لگے تو کبھی مذہبی شدت پسندانہ رویوں کا سامنا رہا۔

ان تمام اعتراضات کے باوجود تحریکِ علی گڑھ اور بالخصوص علی گڑھ کالج نے علمی و ادبی اور سیاسی حوالے سے اپنا کام زور و شور سے جاری رکھا کئی سیاسی راہنما سامنے آئے اور مسلمانوں کی جدوجہد اور کشتی کو سہارا فراہم کرتے ہوئے اس تحریک کو تقویت فراہم کرنے کا باعث بنے اسی حوالے سے ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب ''اردو ادب کی تحریکیں'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کی اس پس ماندگی کو سیاسی انداز میں دور کرنے کی کوشش کی اور مدرستہ العلوم کے ذریعے ان کی بصیرت کو بدرجہ اُتم بڑھایا۔ اخبار تہذیبُ الاخلاق کے ذریعے ذہنی انقلاب کی راہ ہموار کی اور تراجم کے ذریعے ان علمی خزانوں کو مسلمانوں کے گھروں میں پھیلادیا جو پہلے یورپ کے کُتب خانوں میں مدفون تھے اور جن تک مسلمانوں کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک کا سیاسی زاویہ نہ صرف متحرک نظر آتا ہے، بلکہ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور تمدنی زندگی میں بھی انقلاب بپا کیا اور ایک جداگانہ قوم کا احساس پیدا کر کے سیاسی کامیابیوں کی راہ ہموار کی۔''(۹)

ڈاکٹر انور سدید اور مختار مسعود کی مشترکہ رائے علی گڑھ کالج، تحریک اور اس جدوجہد کے حوالے سے سامنے آتی ہے جس کو تحریکِ پاکستان کی بنیاد بھی قرار دیا جاتا ہے۔ ان رویوں کی ترقی اور تحریک کی صورت میں مشترکہ سیاسی مقاصد اور ان مقاصد کی تکمیل کے لیے منظم جدوجہد نے کامیابی کی راہ ہموار کی۔

مسلمانوں کے انداز نو آبادیاتی نظام کے خاتمے، الگ نظریے، الگ قوم و ملت کے تصور اور مذہبی طور پر الگ شناخت کا جذبہ نہ صرف اُبھرا بلکہ ایک سیاسی جدوجہد کا آغاز ہو گیا جس سے مسلمانوں کی زندگیوں میں تہذیبی و ثقافتی اور بعد ازاں سیاسی شعور کی پختگی کے باعث انقلاب بپا ہو گیا۔

جس کے باعث برطانوی تسلط کا خاتمہ ممکن ہوا سیاسی پس ماندگی کا خاتمہ یقینی ہوا اور لوگ الگ وطن کی جدوجہد میں پیش پیش رہنے لگے متحرک انداز میں انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل ہونے لگا۔ علمی و ادبی حوالے سے بھی مختار مسعود نے اپنے سیاسی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے تحریکِ علی گڑھ اور قیامِ پاکستان کے تعلق کو منسلک کرتے ہوئے اس کی اہمیت کو بیان کیا ہے اس راہ میں جتنی بھی مشکلات آتی رہیں مسلمانوں کے عمل پیہم اور یقینِ محکم کی بدولت اس کا مقابلہ ہر میدان میں کیا گیا بالآخر قراردادِ پاکستان اور کچھ عرصہ بعد الگ مملکت کا قیام شرمندہ تعبیر ہوا۔

برصغیر پاک و ہند کا سیاسی، نو آبادیاتی اور مذہبی منظر نامہ تاریخی و سیاسی شعور کی بنیاد پر مختار مسعود نے بیان کرتے ہوئے اس کے دورس اثرارت اور نتائج کے حوالے سے بھی درپیش سیاسی و سماجی حالات کا تذکرہ اور عکاسی کی ہے۔ جہاں مسلمانوں کے الگ وطن اور تشخص کے لیے جدوجہد جاری تھی وہاں پر ہی کچھ شرپسند عناصر اس کی تعمیر و ترقی کے خلاف اقدامات میں سرگرمِ عمل تھے۔ مختار مسعود نے ان شرپسند عناصر اور مسلم دشمن عناصر کے حوالے سے بھی پردہ فاش کرتے ہوئے انہیں منظرِ عام پر لا کھڑا کیا ہے۔

یہ عناصر مینارِ پاکستان کی تعمیر، قراردادِ پاکستان کی منظوری اور آزادی کی جدوجہد کے خلاف مختلف طریقوں سے نقصان پہنچاتے اور ہر سطح پر اختلافات کی راہ ہموار کرتے ہوئے اس سفر کو مبہم و تنہا بنانے کی کوشش کرتے۔

یہ طبقہ کبھی اُردو زبان پر حملہ آور ہوتے ہوئے اسے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کا طریقہ واردات، برصغیر میں الگ زبان کا تصور، حکمرانی اور ہندی اُردو تنازعہ کھڑا کرتے تو کبھی سیاسی حوالے سے مذہب کو بنیاد بنا کر مذہبی طور پر شدت پسندی کا ثبوت پیش کرتے۔ عباست گاہوں پر حملہ آور ہوتی، مسلمانوں کو مذہبی طور پر مفلوج رکھنے مزموم سازشیں کی جاتی اور انگریز کا یہ حمایت یافتہ طبقہ تحریکِ پاکستان اور تحریکِ آزادی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتی۔

یہ رویہ کانگریسی سوچ کا عکاس تھا ان کی نیت میں منافقت اور دوغلا پن موجود تھا جس کے اثرات اس پروردہ نسل کی صورت میں سامنے آئے جو مسلمانوں اور ان کے حقِ خود ارادیت و آزادی کے خلاف تھی۔ قراردادِ لاہور کی منظوری کے بعد اس طبقہ کی جانب سے اسے قراردادِ لاہور کے بجائے قراردادِ پاکستان کہا گیا اخبارات، رسائل و جرائد میں اسے قراردادِ پاکستان کے نام سے مخاطب کیا گیا۔ سیاسی و سماجی حوالے سے مسلمانوں پر حملے کیے گئے ان کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا اور مخالفین کی ایک ایسی فوج تیار کی گئی جو مینارِ پاکستان کی بنیادوں میں خم ڈالنا چاہتی تھی۔

''مینارِ پاکستان کی بنیادوں کو تحریک کے مخالفین سے بھی فیض پہنچا ہے۔ اکثریت کی بداندیشی نے مسلمانوں کے لیے جو کنواں کھودا تھا وہی مینار کی بنیاد کے کام آیا۔ اقلیت میں چند دور اندیش نکل آئے اور وہ دُور دُور سے بھاری پتھر ڈھو کر لائے تاکہ بنیادیں مضبوط ہوں۔ ان چند معماروں کے پیچھے متعصب اکثریت کی ایک فوج مینار کی تعمیر میں مصروف ہے۔ یہ فوج کبھی اُردو زبان پر حملہ کرتی ہے، کبھی مسجد کے آگے باجا بجاتی ہے تجارت میں بائیکاٹ کرتی ہے اور ملازمت میں حق مارتی ہے۔ ''[۱۰]

مختار مسعود نے ان مخالفین کا طرزِ عمل، ارادے، عوامل، اثرات اور طریقہ کار واضح کرتے ہوئے اسے تحریکِ آزادی کی راہ میں رکاوٹیں حائل کرنے والوں میں شمار کیا ہے۔ یہ طبقہ مذہبی حوالے سے اتنا شدت پسند تھا کہ عبادت گاہوں کے سامنے موسیقی کے آلات بجائے جاتے، بنیادی حقوق سلب کیے جاتے، برصغیر کے سیاسی

محکموں، اداروں میں مسلمانوں کا حق غضب کیا جاتا، تجارت میں بائیکاٹ کا انداز اپنایا جاتا مسلمانوں کو سیاسی و سماجی معاملات کے علاوہ معاشی طور پر بھی نقصان پہنچایا جاتا۔

قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد ہنگامے عروج پر پہنچ گئے۔ گاندھی کی منافقت آمیز پالیسی کا پرچار ہونا شروع ہو گیا، کہا گیا کہ پاکستان کا قیام، وجود اور اس حوالے سے کی جانے والی جدوجہد ہندوؤں کے لیے خودکشی کے مترادف ہے۔ مسلمانوں کو دھمکیاں دی گئیں کہ وہ اقلیتوں جیسا، غیر ملکیوں جیسا سلوک برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ انہی عوامل کو دیکھتے ہوئے سیاسی حوالے سے دو تحریکیں وجود میں آتی ہیں، شُدھی و سنگٹھن جس کی بنیاد پر مسلمانوں کی نسل کشی کا منصوبہ منظرِ عام پر آتا ہے۔

ہندو راہنماؤں نے، عوام نے اور شدت پسند عناصر نے اپنے عہدے، اقتدار کی لالچ، اخبارات، علمی و ادبی سرمایہ، تجارتی معاملات غرض سبھی کچھ مسلمانوں کی مخالفت میں جھونک دیے۔ مسلمانوں کے پاس اس وقت قائداعظم اور ان کے قریبی ساتھی موجود تھے جو اس عمل کا تریاق سیاسی فہم و فراست سے نکالنا چاہتے تھے لہٰذا اُنھوں نے ان ہنگاموں کے باوجود اپنا سیاسی سفر جاری و ساری رکھا اور پاکستان کی تعمیر و ترقی اور آزادی کے لیے جدوجہد بلاخوف و خطر جاری رکھی۔

مختار مسعود نے اپنے شاملِ کتاب مضمون ''مینارِ پاکستان'' میں برصغیر کے سیاسی و سماجی حالات کا نقشہ کھینچتے ہوئے دونوں اطراف کے مقاصد، نظریات، عوامل، اثرات اور بعدازاں نتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے اس سیاسی سفر کی مکمل داستان قلمبند کی ہے یہ ان کے تاریخی، سیاسی اور سماجی شعور کا نتیجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے اسلوب کی چاشنی کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخ جیسے موضوع کو غیر جانبدارانہ انداز میں اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔

''مینار کی سرافرازی کی قیمت نہ جانے ان کی کتنی نسلوں کو ادا کرنی پڑے۔ جو قیمت وہ ادا کرتے ہیں وہ ہمارے حساب میں قرضے کے طور پر لکھی جاتی ہے اور یہ قرضہ ہے کہ روز بروز بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو پیچھے رہ گئے ہیں وہ تو ہمارے ساتھ چلے تھے کہ یہاں ان کو بھی شہ نشین پر جگہ ملے گی مگر وہ ابھی تک خاک بسر ہیں۔ میں نے دل میں

سوچا، یہ بھی عجیب بات ہے کہ آزادی اور علیحدہ وطن کے لیے تو ہماری دُعائیں صرف ساتھ سال کی قلیل مدت میں قبول ہو گئیں مگر کچھ دُعائیں جو ہم نے مانگی تھیں ان پر تو دہائیاں بیت گئیں ہیں اور درِ قبولیت ابھی تک وا نہیں ہوا ان دُعاوں میں سرِ فہرست دُعائے کشمیر ہے۔"(۱۱)

مختار مسعود سیاسی حالات کا تذکرہ سماجی تناظر میں بیان کرتے ہوئے مینارِ پاکستان کی تخلیق، جدوجہد میں شریک لوگوں ان کی قربانیوں اور وفاداریوں کا اظہار کرتے ہوئے اس کی عملی شکل پیش کرتے ہیں۔ اسی دوران وہ اس امر کی جانب بھی توجہ مبذول کرواتے ہیں کہ ان کی جدوجہد الگ ریاست، الگ جمہوری نظام جہاں مسلمان آزادنہ زندگی بسر کر سکتے یہ خواب کشمیر کی صورتحال کے پیشِ نظر دھندلا ہو چُکا ہے۔

دہائیاں بیت جانے کے بعد بھی کشمیر کی عوام کو حقِ خود ارادیت میسر نہیں آیا۔ مسئلہ کشمیر کا تعلق بھی تحریکِ پاکستان اور پاکستان کے وجود کے لیے کی جانے والی کوششوں کا پیش خیمہ تھی لیکن محض سات سالوں کی جدوجہد الگ ریاست پاکستان کے قیام کے لیے کارگر ثابت ہوئی، لیکن کشمیر جیسے جنت نظیر علاقے میں ہندووں کا طاقت اور ظلم و بربریت کا بازار گرم رکھنا الگ سیاسی جدوجہد کو دعوت دیتا ہے۔

مختار مسعود یہاں مسلمانوں کی جدوجہد اور دُعاوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے مسئلہ کشمیر کے ساتھ منسلک کرتے ہیں کہ کشمیر کے لیے کی جانے والی دُعائیں ابھی تک درِ قبولیت پر فائز نہیں ہو سکی وہاں کی اکثریت مسلمانوں کی ہے جو جبر و تسلط پر قائم کی گئی ہے غیر حقیقی و غیر قانونی جابر حکمرانوں و حکومتوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتی ہیں۔ کشمیری عوام آج بھی ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے پاکستانی قوم سے اُمیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں۔

مختار مسعود نے اپنی کتاب ''آوازِ دوست'' کے دوسرے حصے میں چند مشہور سیاسی و سماجی شخصیات کا خاکہ، ان کا طرزِ زندگی اور بالخصوص تحریکِ پاکستان سے وابستہ رہتے ہوئے سیاسی جدوجہد کا عملی نمونہ پیش کیا ہے۔ ان شخصیات سے مختار مسعود نے آٹو گراف لیتے ہوئے ان کی نصیحت کو بھی اپنی کتاب کا ذریعہ بناتے ہوئے سیاسی و سماجی صورتحال کو عصری تناظر میں بیان کی ہے۔

سیاست سے وابستہ افراد سیاسی منظر نامہ اور تاریخی عوامل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مختار مسعود نے مختلف سیاسی و سماجی شخصیات کا تذکرہ بیان کیا ہے۔ جن کی زندگی مختلف طریقوں سے نشیب و فراز میں مبتلا رہتے ہوئے ایک خاص منظر نامے کو پیش کرتی ہیں کہ جب ان سیاسی شخصیات کو اقتدار ملتا ہے تو یہ بنیادی مسائل سے ناآشنا ہو جاتے ہیں اور احساس و مروت جیسے بلند احساسات سے محروم ہو جاتے ہیں یہ ہمارا سیاسی نظام و کلچر کا المیہ ہے جو معاشرے کا ناسور ہے جس سے حقیقی عوامی نمائندگی اور جمہوری اقدار کی نفی ہوتی ہے۔ مختار مسعود لکھتے ہیں کہ:

''حدیث میں آیا ہے شہرت اور ثواب میں بیر نہیں اور ذکر کی وہ افزونی جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے وہ بھی شہرت ہی کا ارفع درجہ ہے۔ شہرت اور ذکر کا جو مقام حدیث و قرآن میں بیان ہے اس کا کیا مذکور جب زندگی میں اعتدال جیسی معمولی صفت بھی غیر معمولی ہو کر رہ گئی ہے۔ اہل اقتدار اور اہلِ اختیار کی زندگی میں ایک دروازے سے اقتدار و اختیار داخل ہوتے ہیں اور دوسرے سے اعتدال اور توازن رخصت ہو جاتے ہیں جس نقار خانے میں نعروں، تالیوں اور آمنا و صدقنا کا شور ہو وہاں اعتدال کی حیثیت طوطی سے بھی کم ہوتی ہے۔''(۱۲)

قحط الرجال میں مختار مسعود نے مکمل سیاسی نظام اس میں شامل افراد، لیڈروں قواعد و ضوابط، اُصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے تاریخی و سماجی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے ان طبقات کا تذکرہ اور ان کی حیثیت پر سیر حاصل نقطہ نظر قلمبند کیا ہے۔ صاحبِ اقتدار اور صاحبِ استطاعت انسان میں آج کے دور میں نمایاں فرق آچکا ہے۔ جہاں لوگ اقتدار ملتے ہی انسانیت اور احساس و مروت سے محروم ہوتے ہوئے ان جذبات کو فراموش کر دیتے ہیں۔ یہ بات قرآن و حدیث اور اس کے مفہوم سے بھی واضح ہوتی ہے کہ ان لوگوں کو وقتی شہرت ملتے ہی وہ غیر معمولی سطح پر اعتدال سے محروم کر دیے جاتے ہیں ایسا رویہ ہمارے معاشرے، سماج میں پایا جاتا ہے کہ تحریکِ آزادی سے لے کر آج کے موجودہ دور، عہد تک سیاسی ڈھانچہ اپنی حقیقی و جمہوری روایات متعین کرنے سے قاصر رہا ہے۔

ج: مختار مسعود کی فکر اور تاریخِ پاکستان کا بیان

مختار مسعود ایسی علمی و ادبی شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں جن کی تحریریں ایک مکمل تاریخی و سیاسی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی کُتب ان کا تاریخی و سیاسی شعور تحریکِ پاکستان کی مستقل اور مسلسل سیاسی و سماجی جدوجہد کا عملی نمونہ ہے۔ انھوں نے تحریکِ پاکستان کا سفر، اس کے لیے مسلمانوں کی جدوجہد، ان کے حالات وواقعات کو اپنی فکر سے مربوط کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔

مختار مسعود کی فکر کے بارے میں ڈاکٹر الطاف یوسف زئی رقمطراز ہیں کہ:

''مختار مسعود عام ڈگر سے ہٹ کر لکھنے والے ادیب ہیں کیونکہ ان کے مخاطب اور قاری عوام نہیں خواص ہیں۔ ان کی تحریر اور اسلوب سے لطف اندوز ہونے کے لیے خاص علمی استعداد رکھنا قاری کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ ان کے ہاں ایک روشن فکر اور مطمئن رُوح کا اثر ہر جگہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ گہرے مطالعے اور وسیع تجربے کی بنیاد پر اپنے مخاطب اور پڑھنے والے کو نئی منزلوں اور اچھوتی حقیقتوں سے آشنا کراتے ہیں۔''[۱۳]

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی نے مختار مسعود کی فکر کو بیان کرتے ہوئے ان کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ جس کے مطابق مختار مسعود کی تحریریں ایک خاص فکر کی ترجمان ہیں جن کو پڑھنے سمجھنے کے لیے بھی ایک خاص ذہنی و علمی سطح اور ہم آہنگی کی ضرورت درکار ہے جس کے مطابق ماضی، حال اور مستقبل کے تاریخی رشتے کو سمجھتے ہوئے مختار مسعود کے گہرے تجربے اور فکر سے آشنائی ممکن ہے۔

تاریخِ پاکستان سے تحریکِ پاکستان اور اس جدوجہد کے پایہ تکمیل تک پہنچنے کا عمل مختار مسعود کی سیاسی بصیرت و فکر کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے ان کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران تعلیمی مراحل اور تدریس کے دیگر مراحل کے ساتھ ان کا تاریخی شعور نہ صرف وابستہ ہے بلکہ ان کی فکر، فکرِ فردا ہے، جو مسلمانوں کی لازوال سیاسی و تاریخی جدوجہد کے بارے میں ایک دستاویز ہے۔ مختلف مراحل کے دوران پاکستان کے قیام کے لیے کی جانے والی کوششوں کو دبانے کی سعی کی جاتی رہی کبھی کانگریسی سوچ

مسلمانوں پر مسلط کی جاتی تو کبھی نام نہاد نو آبادیاتی نظام اور اس کے پیروکار اپنی من پسند پالیسیاں نافذ کرنے کی کوشش میں سرگرمِ عمل دکھائی دیتے۔

اُنھوں نے اپنی فکر کے زیرِ سایہ چند ایسی شخصیات کا خاکہ اپنے مضمون "قحط الرجال" میں کھینچا ہے جو تحریکِ پاکستان کی جدوجہد میں بطورِ کارکن، بطورِ راہنما اور لیڈر کے طور پر پیش پیش رہتے یہی وجہ ہے کہ اس عمل کی پاداش میں انہیں بہت سے مسائل، مشکلات اور پابندیوں کا سامنا رہتا۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہاں برصغیر کے سیاسی منظر نامے میں ہر اس شخص پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے رہے جو الگ وطن اور غیر جانبدارانہ اظہار رائے کا قائل رہا الگ سیاسی سوچ اور مسلمانوں کے لیے الگ وطن کی تگ و دو کی پاداش میں انہیں قید کی جبراً سزا سے نوازا جاتا۔

مختار مسعود نے یہاں حسرت موہانی کا بالخصوص تذکرہ کیا ہے۔ حسرت موہانی کی قید اور پابندیوں کا تذکرہ مختار مسعود نے بیان کرتے ہوئے اسے تاریخ پاکستان کے اُس گوشے سے منسلک کیا ہے جہاں مسلمانوں نے ہر قسم کی سختیاں برداشت کرتے ہوئے نہ صرف اپنی جانوں کا نذرانہ دیا بلکہ ان کی تحریک اور الگ وطن کی جستجو اور آواز کو جلا بخشی ،یہی وہ حسرت موہانی تھے جن کا دماغ بقول مختار مسعود سیاسی جستجو و تگ و دو میں استعمال ہوا، دل ان کا شاعری کے لیے مختص تھا اور پیشانی ان کی عبادت کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔ مختار مسعود حسرت موہانی کا حال پیش کرتے ہوئے تاریخِ پاکستان کی پاداش میں ان کی قربانیوں کا تذکرہ اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ:

"میں سوچنے لگا کہ کیا میری البم میں کسی ایسے شخص کے دستخط بھی موجود ہیں جس کی زندگی اس نصیحت کا عملی نمونہ ہو۔ میں نے ورق الٹے، شاہ اور بانوئے شاہ کو چھوڑ کر میں ایک شاعر کے دستخطوں پر پہنچ کر رُک گیا۔ یہ شخص بھی عجیب ہے۔ چار بار جیل ہوئی گیارہ حج کیے اور تیرہ دیوان شاعری کے مرتب کیے۔ سیاسی ہنگاموں کا حساب اور عوامی تحریکوں کا شمار ناممکن ہے۔ ملک کے لیے آزادی مانگی تو کالج سے نکالے اور حوالات میں داخل کیے گئے۔ کُتب خانہ

اُردوئے معلی ضبط ہوا نایاب قلمی نسخے پولیس ٹھیلوں پر لاد کر لے گئی، مسودات ان کے سامنے جلائے گئے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنائی گئیں اور پاوں میں بیڑیاں ڈالی گئیں۔''(۱۴)

حسرت موہانی کو آزادی کی جستجو اور پاداش میں انتہائی دردناک حالات کا سامنا رہا جن کی عکاسی وہ اپنے الفاظ اور تاریخِ پاکستان کے پسِ منظر میں بیان کیا ہے۔ ظلم و ستم کی لازوال داستانیں رقم ہوتی رہیں مسلمان سیاسی راہنماوں کو الگ وطن کے لیے تحریک چلانے پر مشکلات، تکالیف اور پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

پُرفتن دور میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا اور غلامی سے نجات دلانا چند لوگوں کا فریضہ نہ تھا بلکہ یہ ایک مجموعی جدوجہد اور منظم تحریک کا پیش خیمہ تھا جس کی بدولت نو آبادیاتی نظام سے خاتمہ ممکن تھا اور پاکستان کا جو دان قربانیوں کا نتیجہ تھا جو حسرت موہانی جیسے بلند و بہادر تحریکِ پاکستان کے سپاہیوں نے دی تھی۔

انگریز حکومت کی جانب سے حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان کو مختلف پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا جس کا اظہار تاریخی پیرائے میں مختار مسعود تاریخِ پاکستان کے بیان میں کرتے ہیں۔ صحافتی میدان میں آزادی اظہارِ رائے پر عائد پابندیاں اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھیں کہ حکمران طبقہ اپنی ناجائز ظلم و ستم کی داستانیں سُننا گوارا نہیں کرتا لوگوں کو سچ کی راہ دکھانا اس دور کا جرمِ عظیم قرار دیا جانے لگا اور انگریز حکمرانی کے خواب طویل دیکھتے ہوئے ان راہنماوں کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے لگے۔

مولانا ظفر علی خان کی سیاسی جدوجہد اور تاریخِ پاکستان کے پسِ منظر میں ان کی قربانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مختار مسعود نے ان کے نکالے جانے والے اخبار ''زمیندار'' کا تذکرہ بھی کیا ہے جسے نو آبادیاتی نظام کے زیرِ اثر نہ صرف بند کیا گیا بلکہ آزادی اظہار پر بھی مستقل پابندیاں نافذ کر دی گئیں، تاکہ آزادی کی آواز دب جائے اور مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انگریز کی غلامی میں مبتلا رہیں۔

تقاریر، اظہار رائے پر، لکھنے پڑھنے، سوچنے سمجھنے پر پابندیاں لگائی گئیں۔ مختار مسعود نے اپنی فکر کے تابع اس صورتحال کو تاریخِ پاکستان کے سانچے میں بیان کرتے ہوئے جب عطا اللہ شاہ بُخاری سے گفت و شنید کی تو انُھوں نے اس صورتحال کو مزید بہتر انداز میں کھول کر سامنے رکھ دیا وہ کہتے ہیں کہ:

''شاہ جی نے فرمایا کہ ہمیں اپنے مقصد میں اس لیے کامیابی نہ ہو سکی کہ دو برس کے عرصے میں فرنگی تعلیم اور تہذیب نے اپنا پورا تسلط جما لیا تھا۔ آسودہ حال لوگ علی گڑھ کی طرف چلے گئے اور ناکارہ آدمی دینی مدارس کے حصے میں آئے۔ جنگِ آزادی کی ہمہ ہمی میں سیاست دین پر اور منافقت دُنیا پر غالب آئی۔ ساری توجہ اور توانائی نئی تعلیم اور نئی سیاست کی نذر ہو گئی جو لوگ باقی رہے ان میں کچھ ہندو تمدن کے زیرِ اثر رہ کر گمراہ ہو گئے۔ صرف بچے کھچے اور لٹے پٹے لوگ ہی دین کے قافلے میں شامل ہوئے۔ ہمارا سرمایہ خوب تھا مگر نسل ناخوب تھی، نتیجہ ظاہر ہے، آبائی ورثہ بھی کھویا اپنی کمائی بھی گنوائی اور مستقبل کو بھی مخدوش بنا دیا۔''(۱۵)

عطا اللہ شاہ بُخاری کے ان جذبات کی عکاسی مکمل تاریخِ پاکستان کا نچوڑ ہے جس کو مختار مسعود نے اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے کہ ہمارا تمدن انگریز کی آمد کے ساتھ مختلف مراحل میں محو ہوتا چلا گیا چند لوگ اس کی مخالفت میں سامنے آئے وہ پابندیوں اور ظلم و ستم کا نشانہ بنا دیے گئے چند دینِ اسلام کی طرف راغب ہوئے چند فرنگی تعلیمی نظام سے مائل ہوتے ہوئے انگریزوں کی صف میں جا کھڑے ہوئے، بقیہ مستقبل کی فکر میں ٹھوکریں کھانے لگے۔

یہ ایک مشکل سفر تھا جو الگ وطن کی طلب، تگ و دو، جستجو کے لیے شروع ہوا تھا عظیم راہنما میسر نہ آتے تو قوم کسی صورت بھی یکجا نہیں ہو سکتی تھی۔ قائداعظم، علامہ اقبال، حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان جیسے سپاہی اور لیڈر جن کا تذکرہ خود مختار مسعود نے تحریکِ پاکستان اور تاریخِ پاکستان کے آئینے میں کیا ہے۔ ان کی قربانیاں لازوال ہیں جس کی بدولت ہر سطح پر ظلم و ستم اور پابندیوں کا سامنا کرنے کے باوجود یہ سیاسی سفر جاری و ساری رہا اور الگ وطن پاکستان کی صورت میں ایک واضح اسلامی ریاست دُنیا کے نقشے پر اُبھری جس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا۔

مختار مسعود نے اپنے مضمون ''قحط الرجال'' میں کئی دوسری شخصیات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جس میں ٹائن بی کے حوالے سے ان کی رائے اور تاریخ کے مطالعے میں ٹائن بی کی تحقیقات کا کردار شامل ہے۔ راجا صاحب محمود آباد کی شخصیت کا مرقع علی گڑھ کے تناظر میں شاملِ مضمون ہے جبکہ ابوالکلام آزاد کی نثر اور ان کے خیالات پر مختار مسعود کی رائے تحریکِ پاکستان کے ساتھ منسلک کرتے ہوئے ایک غیر جانبدارانہ تجزیہ ہے۔

مختار مسعود نے اپنی فکر کے احاطے میں سروجنی نائیڈو کا مکمل سراپا پیش کیا ہے۔ جن کے نظریات غیر مسلم ہونے کے باوجود مذہبِ اسلام اور ان کے پیروکاروں کے لیے مثبت اور مناسب تھے وہ انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ مسلم کمیونٹی کی عزت و تکریم کرتے ہوئے نیک جذبات رکھتی رہی مختار مسعود کے بقول وہ ان کی شخصیت سے ان کے اقوال سے ذاتی طور پر بہت متاثر تھے۔ ٹائن بی کی کتاب ''تاریخ کا ایک مطالعہ'' مختار مسعود کے شاملِ کتاب مضمون ''قحط الرجال'' کا حصہ رہی جس میں ٹان بی نے مختلف تہذیبوں کا ذکر کیا ہے۔

ان تہذیبوں کے عروج و زوال اور ان کے اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ ٹائن بی کے مطابق جب کوئی قوم یا معاشرہ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے فتح حاصل کرلیتا ہے تو وہ نئی تہذیب کی بنیاد ڈال لیتا ہے۔ مختار مسعود نے قیامِ پاکستان اور اس کے بعد کی صورتحال کو اپنی فکر کے ساتھ منسلک کرتے ہوئے اس کا تجزیہ کیا ہے، کہ آزادی کتنی بڑی نعمت ہے جبکہ آزادی حاصل کرنے بعد تاریخ کا مطالعہ ہمارے لیے کون سے راستے متعین کرتا ہے اس حوالے سے اُنھوں نے ۱۹۵۸ء اور ۱۹۷۱ء کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ہم نے بڑے بڑے منصوبے تیار کیے دُنیا نے ان کی تعریف بھی کی، مگر تاریخ نے ہماری ایک بھی نہ چلنے دی۔ تاریخ نے اپنا رشتہ ہمارے اعمال کے ساتھ استوار کرلیا اور ایک دن ہمیں ڈھاکہ ریس کورس میں لا کھڑا کیا۔ یہ دسمبر ۱۹۷۱ء کی بات ہے۔ اس روز ہم نے مُڑ کر اپنی تاریخ پر نظر ڈالی تو ہمیں یاد آیا کہ تریخ کو کسی تاریخ داں نے جرائم، حماقتوں اور بدقسمتی کی فہرست کہا ہے۔ اگر ہماری تاریخ سے ۲۳ مارچ اور ۱۴ اگست کے دن نہ ہوتے تو ہم تاریخ کی اس تعریف پر ایمان لے آتے۔''(۱۶)

مختار مسعود نے اپنے تاریخی شعور کے زیرِ سایہ سانحہ مشرقی پاکستان کا حوالہ دیتے ہوئے اسے قیامِ پاکستان کے بعد رونما ہونے والا عظیم نقصان اور سانحہ قرار دیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے مسلم قوم آزادی کے بعد کئی کارنامے سرانجام دینا چاہتی تھی لیکن کمزور حکمت عملی اور ناقص سیاسی نظام کی بدولت یہ مراحل طے کرنا انتہائی مشکل ثابت ہوا۔

تاریخ میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کا دن مسلمانوں کے لیے خاص اہمیت کا حامل ہے یہ دن مسلمانوں کے مقاصد ان کے نظریات اور مستقل جدوجہد اور بالخصوص پاکستان کے قیام کے لیے لازوال دن قرار دیا ہے۔ اگر ملکی صورتحال، سیاسی پالیسوں اور قومی قیادت کی عدم توجہی سامنے آئے تو ملک دولخت ہو جاتا ہے۔ جس کی مثال ۱۹۷۱ء کا سانحہ مشرقی پاکستان ہے۔ مسلمانوں کی جدوجہد محض زمین کے ٹکڑے کو حاصل کرنے محدود نہیں تھی بلکہ اقوالِ قائداعظم کی روشنی میں ایسی مملکت کا قیام ہمارا اولین نصب العین تھا جس کے مطابق ہم مذہبی آزادی اور قومی وحدت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک مضبوط قوم و ملت کے تحت وطن کے لیے جدوجہد اور قربانیاں دیں۔ لیکن شاید تاریخ نے اتنی مہلت مسلمانوں کو نہ دی کہ و متحد ہو سکیں اور چند سالوں بعد مشرقی پاکستان کا سانحہ ہماری تاریخ کا ایک بدنما داغ ثابت ہوا۔

مختار مسعود کی فکر اور تاریخِ پاکستان کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت سے اہم عوامل سامنے آتے ہیں۔ بطور سرکاری منصب کے مختار مسعود ان سرکاری ذمہ داریوں کے باوجود ایک مورخ، ایک ادیب اور غیر جانبدار تاریخ کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے ان حقائق کو سامنے لاتے ہیں جو تاریخِ پاکستان اور تحریکِ پاکستان کا حصہ بنے۔ اپنے دونوں مضامین جو ان کی کتاب "آوازِ دوست" میں شامل ہیں مختار مسعود نے تاریخ اور تاریخی شخصیات کا تجزیہ غیر جانبداری سے پیش کیا ہے۔

مضمون "قحط الرجال" میں جہاں سیاسی و سماجی شخصیات کا خاکہ پیش کیا گیا ہے وہاں پر ہی تحریکِ پاکستان میں ان شخصیات کا کردار اور عملی سطح پر ان کے افعال کو بیان کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے انگریز نو آبادیات کے ظلم و

ستم کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو حق و سچ کے راستے پر گامزن الگ وطن کی تگ و دو میں مصروف قوم اور ان کے راہنماوں پر مختلف پابندیوں اور مظالم پر سر گرمِ عمل رہی۔

مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، ابوالکلام آزاد، سروجنی نائیڈو، عطااللہ شاہ بخاری، ٹائن بی، قائداعظم، فاطمہ جناح، جیسے کئی عظیم شخصیات کے اقوال اور اعمال کو مختار مسعود نے اپنی کتاب کا حصہ بناتے ہوئے تاریخِ پاکستان میں ان کا کردار واضح کیا ہے۔ انگریز حکومت کے سامنے ان شخصیات کا ڈٹے رہنا اور اپنی قوم کی ہر سطح پر راہنمائی اور تحریکِ پاکستان میں مسلمانوں کی تگ و دو میں پیش پیش رہنا نا قابلِ فراموش داستان ہے جن کی تکمیل ایک آزاد اسلامی جمہوریہ پاکستان کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔

مختار مسعود نے قائداعظم کی سوچ ان کے کردار کو واضح طور پر بیان کرتے ہوئے برصغیر میں ان جیسی شخصیت کا وجود مسلمانوں کے لیے بہت بڑا انعام قرار دیا ہے جو مشکلات کے باوجود مسلمانوں کی سیاسی و سماجی جدوجہد میں بطور قائد ہر جگہ ڈھال کی صورت میں پیش پیش رہے ان کی بلند سوچ اور عمل کا نتیجہ ہے کہ ایک الگ ریاست کا قیام ممکن ہوا۔

۲۔ سفر نصیب:

مختار مسعود کی دوسری کتاب کا نام "سفر نصیب" ہے۔ یہ کتاب جنوری ۱۹۸۱ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی بعد ازاں اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو کر ادب کے قارئین کے لیے پڑھنے کا باعث بن چکی ہے۔ "آوازِ دوست" کی شہرت اور مختار مسعود کا مخصوص اسلوب اُردو ادب کے لیے پہلے سے ایک مقام متعین کر چکا تھا کہ مختار مسعود کی دوسری کتاب "سفر نصیب" کے نام سے منظرِ عام پر آتی ہے۔ اسی جستجو اور شوق و ذوق کے نتیجے میں اس کتاب کو بھی اُردو ادب میں تحسین کی نگاہ سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔

یہ کتاب اپنی صنف کے اعتبار سے بھی منفرد اور جُداگانہ ہے کیونکہ اس کتاب میں خاکہ اور سفر نامہ جیسی دو نثری اصناف کو بیک وقت برتا گیا ہے۔ ان دونوں اصناف کے التزام سے یہ کتاب ایک منفرد کتاب ہے جو ادب کے قارئین کے لیے ایک کتاب میں دونوں اصناف سے متعارف کروانے کا ذریعہ بھی ہے۔

مختار مسعود کی کتاب ''سفر نصیب'' میں سفر نامہ کی حیثیت سے بھی مواد موجود ہے اور مختار مسعود نے اس کتاب میں دو شخصیات کے خاکہ بھی قلمبند کیے ہیں اس لحاظ سے سفر نصیب ایک ایسی کتاب ہے جس میں سفر نامہ کے لوازمات اور دلچسپ حقائق بھی ملتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ دو اہم شخصیات سے واقفیت بھی، یہ شخصیات مختار مسعود کے زبانی خاکے کی صورت میں قارئین کے ذوق کو جلا بخشنے کا باعث بنتی ہے۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں ایک حصہ اول: جو دو ذیلی حصوں جن کے عنوانات '' برف کدہ'' اور ''پس انداز'' ہیں جبکہ حصہ دوم: بھی دو ذیلی حصوں جن کے عنوانات بالترتیب ''طرفہ تماشا'' اور ''زادِ سفر'' کے نام سے منسوب ہیں، کتاب کا حصہ ہیں۔ مختار مسعود نے کتاب کی تقسیم کے دوران بھی ایک حصہ سفر نامہ اور ایک حصہ خاک کے ساتھ منسلک رکھا ہے۔ '' برف کدہ'' جو کہ حصہ اول کا پہلا ذیلی حصہ اور عنوان ہے ایک مکمل سفری داستان کی حیثیت رکھتا ہے جو کہ قبائلی علاقہ جات کی طرف سفر کی مکمل سفری روداد کو پیش کرتا ہے۔ جبکہ اس کے ساتھ منسلک دوسرا حصہ ایک خاکہ ہے جو ''پس انداز'' کے نام سے منسوب ہے۔

یہ خاکہ ڈاکٹر کے-ایل حیدر کی شخصیت پر مختار مسعود کی زبانی لکھا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ کتاب کا ایک حصہ مکمل ہو تا ہے۔ دوسرے حصے میں بھی دو ذیلی عنوانات کے تحت ایک سفر نامہ اور دوسرا خاکہ موجود ہے۔ سفر نامہ، ''طرفہ تماشا'' کے عنوان سے موجود ہے اور یہ سفر دیارِ غیر کی سیر اور مشاہدات، تجربات و حقائق پر لکھا گیا ہے۔ جبکہ آخری حصہ ''زادِ سفر'' کے نام سے ''سفر نصیب'' کا دامن پکڑے فضل الرحمٰن کی شخصیت کو مختار مسعود کی زبانی ایک خاکہ کی صورت میں سامنے لانے کا باعث بنتا ہے۔

مختار مسعود نے اپنے الگ طرزِ اظہار کی بنا پر سفر نصیب کا دیباچہ بھی انتہائی مختصر رکھا ہے اور چند عوام کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے مختصر انداز میں پیش کیا ہے۔ اُنھوں نے دیباچہ میں کتاب کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر حصہ میں دو مضمون ہیں ایک سفری داستان اور ایک شخصی خاکہ۔ اس اعتبار سے اُنھوں نے کتاب کی تقسیم کو پڑھنے والوں کے لیے خود ہی آسان کر دیا ہے کہ یہ

ایک طرف سفری داستان سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرے گی تو دوسری جانب شخصیات سے واقفیت کا ساماں خاکوں کو صورت میں مہیا کیا جائے گا۔

مختار مسعود نے اپنی کتاب ''سفر نصیب'' میں مختلف علاقوں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہاں کی مقامی تہذیب و ثقافت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ تاریخیت کے مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ تاریخی حوالوں کے ساتھ ساتھ جب کوئی ادیب کسی معاشرے وہاں کے کلچر، تہذیب و ثقافت کا احوال بیان کرتا ہے تو وہ تاریخیت کے عناصر میں شمار ہوتا ہے۔ مختار مسعود نے اپنی کتاب ''سفر نصیب'' میں بطورِ عینی شاہد کہ سفر کی مکمل روداد قلمبند کرتے ہوئے قبائلی علاقہ جات کے ساتھ ساتھ دیارِ غیر کی سیر کے دوران بھی وہاں کے لوگوں، ان کے حالات، ان کا لباس کلچر، مذہبی طرزِ عمل، زبان، تہذیب و ثقافت کا احوال قلمبند کیا ہے۔ سفر نصیب کے حصہ اول میں جو ''برف کدہ'' کے عنوان سے شاملِ کتاب ہے، مختار مسعود نے قبائلی علاقہ جات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان علاقوں میں چترال، سکردو، تربیلہ، سوات، کالام، کاغان، شوگراں، لواری ٹاپ و دیگر مقامی علاقوں کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کی مقامی تہذیب و ثقافت رہن سہن، طرزِ عمل و زندگی کے نشیب و فراز سے قارئین کو واقفیت فراہم کی ہے۔

الف: مقامی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ

مختار مسعود نے دورانِ سفر مختلف قبائلی علاقہ جات کا نہ صرف سفر کیا بلکہ وہاں جا کر لوگوں کا طرزِ زندگی، رہن سہن، مقامی تہذیب و ثقافت کو دیکھتے ہوئے وہاں کے طبعی خدوخال اور حالات کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔ سفر کی روداد قلمبند کرتے ہوئے مختار مسعود نے سفر نامہ کے بنیادی خدوخال کا بھی خیال رکھا ہے۔ سفر نامہ کے عناصر میں بھی یہ چیز شمار ہوتی ہے کہ جہاں کا سفر کیا جائے وہاں کی تہذیب و ثقافت حالات و واقعات، مذہبی رویے، معاشرتی روابط سے آشنائی حاصل کرتے ہوئے اسے اپنے مشاہدات کی بدولت تحریری آہنگ عطا کرنا تاکہ پڑھنے والے کے لیے یہ بطورِ معلومات کارگر ثابت ہو سکے۔

مختار مسعود سرکاری عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود ایک سفری ذوق رکھتے تھے۔یہی وجہ سے کہ ہر سفر کی داستان بخوبی مشاہدات کے عوض بیان کی گئی ہے۔اُردو زبان و ادب میں اگر سفر نامہ کی روایت کو پرکھا جائے تو سفر نامہ کے فنی لوازمات میں شامل عناصر کی پاسداری کرتے ہوئے اُسے معلومات کا وافر ذریعہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

قبائلی علاقہ جات کا طرزِ عمل ان کی زبانی قارئین کے لیے سود مند ثابت ہوتا ہے کہ اپنے علاقے میں رہتے ہوئے دور دراز پاکستان کے خوب صورت شہروں اور وادیوں کا سفر لفظ بہ لفظ اسلوب کی چاشنی سے بھرپور معلومات کے علاوہ لطف اندوز ہونے اور تہذیبی و ثقافتی شعور کو اُجاگر کرنے میں کارآمد ثابت ہوتا ہے۔سفر کے بارے میں اور وادی سوات کے دلکش نظاروں اور ان علاقوں کی مخصوص تہذیب و ثقافت کو اُجاگر کرتے ہوئے مختار مسعود رقمطراز ہیں کہ:

''فاصلہ قدموں میں نہیں ذہن میں ہوتا ہے۔یہ محض ایک حجاب کا نام ہے۔اُٹھ گیا تو ساری مسافت فوراً کٹ جاتی ہے۔مسافر جب پہلی بار اس وادی میں داخل ہوا تو اسے سفر میں پورے دو دن لگے تھے اور دو جگہ رُک کر داخلہ کا اجازت نامہ دکھانا پڑا تھا۔یہ وادی سوات ہے۔اُن دنوں گمنام اور بہت خوبصورت تھی۔آج مشہور اور پامال ہے۔شہرت کتنی نقصان دہ ہوتی ہے، کہ جس خوبی کی وجہ سے حاصل ہو اُسی کے زوال کا باعث بن جاتی ہے۔''[۱۷]

اُنھوں نے یہاں وادی سوات کا نہ صرف تذکرہ کیا ہے۔بلکہ اپنے زمانہ نوجوانی کے اعدادوشمار بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ چند برس قبل بھی اس وادی میں آچکے ہیں جب یہ وادی انتہائی خوب صورت اور گمنام ہوتی تھی اس سے مُراد یہ کہ اس وادی کی رونقیں آج کے دور کے لحاظ سے کم تھیں لوگ بہت زیادہ یہاں کا رُخ نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی خوبصورتی کئی سیاحوں اور عام لوگوں سے پوشیدہ تھی۔

وہ اس کے علاوہ اپنے تاریخی شعور اور سفری ذوق کو باہم مربوط کرتے ہوئے لکھا کہ درحقیقت فاصلہ انسانی سفر یا قدموں میں نہیں بلکہ ذہنی ارتقاء اور ذہن میں ہوتا ہے۔بنیادی طور پر مختار مسعود بطورِ ادیب سرکاری

عہدوں پر کام کرنے کے باوجود بلند فہم و فراست کے حامل فکری طور پر آزاد منش طبیعت رکھتے ہوئے ہر بات میں تاریخی حوالہ تلاش کرتے ہوئے تحریر کی خوبی میں دوچند اضافہ کرتے ہیں۔

انسان زمانہ قدیم سے زمانہ جدید تک ظاہری اعتبار سے بہت سفر کر چکا ہے، لیکن حقیقت میں وہی سفر انسانی زندگی اور ترقی کا ضامن رہا ہے جو ذہنی اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ انسانی شعور میں اضافہ، وسعت کُشادگی انسان کے مسائل کا حل اور انسانیت کی ترقی کا ضامن ہے۔ وہ وادی سوات کی خوبصورتی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس علاقے کے مخصوص خدوخال بیان کیے ہیں۔

یہ وادی آزر میں اتنی مشہور و معروف نہ تھی جتنا آج کل کے زمانے میں لوگ یہاں بطورِ سیاح جوق در جوق جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگ سادہ طبعیت، پہاڑوں کے راہی، شہروں کی نسبت کم ترقی یافتہ، ماحول کی نسبت فطرت کے نزدیک، خوشگوار تند و تیز موسم کی بدولت طبعیت میں شادابی، فطرت کا نکھار، قدرت کے جگہ جگہ پھیلے رنگ، پہاڑوں کی بلندی، دریا کی خوبصورت آواز اور خوب صورتی اس وادی کے حُسن میں بے پناہ اضافہ کرتی ہے۔

وادی سوات کے علاقے، کالام، بحرین، مدین، مالم جبہ و دیگر مقامی علاقے ایک مخصوص علاقائی و روایتی تہذیب و ثقافت کے پاسدار ہیں، جہاں مختا مسعود نے سفر کے دوران، ان خیالات کو رقم کیا ہے جو اس وای کی خوبصورتی و مقامی رنگ میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔

مختار مسعود نے سوات کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور وہاں کے حالات و واقعات اپنی کتاب "سفر نصیب" میں قلمبند کیے۔ مقامی لوگوں کے رہن سہن، طبعی خدوخال وقت کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ان علاقوں کی حالت کا تبدیل ہونا لوگوں کے رہن سہن میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی واقع ہونا، ان علاقوں کی قدرتی خوب صورتی سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہونا، اپنی زبانی اس کتاب کا حصہ بنایا ہے۔ سیر سے واپسی کے دوران یہاں کے رہنے والوں کی بدوباش اور ظاہری حالت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

’’سیر سے واپس آئے تو بنگلے کے باہر ایک پُرانی مگر لمبی سی موٹر کھڑی تھی۔ اخروٹ کے درخت کے نیچے دری بچھا کر چند آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ شلوار قمیض سب کی میلی، پستول اور بندوقیں سب کی دیسی، سفر کی تھکن اور مٹی سب کے چہروں پر۔ درمیان میں اکہرے بدن کا جوان بیٹھا گا رہا تھا۔ وہ تان لگاتا تو بائیں ہاتھ کو کان پر رکھ لیتا۔‘‘(۱۸)

مختار مسعود نے یہاں ان علاقوں کے رہنے والوں کا مخصوص لباس، رہن سہن اور وقت گُزارنے کے لیے شباب کی محفلیں برپا کرنا، قدرتی فضا میں معطر ہوتے ہوئے اپنا موسیقی کا مشغلہ جاری رکھنا اور درختوں کے سائے میں گنگنانا شامل ہے۔ ان کے لباس اور ظاہری وضع قطع سے میلے دکھائی دیتے ہیں اور اپنی حفاظت اور تاریخی ورثے کے امین ان لوگوں کے ہاں دیسی قسم کے اسلحہ جات ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

ان کے لباس کے ساتھ ساتھ گھریلو استعمال کے لیے ان کے بستر، چادریں اور تکیہ وغیرہ پر مخصوص قسم کے روایتی نقش و نگار موجود ہوتے ہیں۔ جن کو دیکھنے سے ان علاقوں اور یہاں کے رہنے والوں کی مخصوص ثقافت اور اس کے مختلف رنگ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ مختار مسعود نے ان لوگوں کے مخصوص ناموں کے حوالے سے بھی بڑی تحقیق اور مشاہدہ کرتے ہوئے اسے بیان کیا ہے کہ یہاں کے رہنے والوں کے نام اکثر و بیشتر خاں کا لفظ اپنے نام کے ساتھ ضرور استعمال کرتے ہیں لہذا یہاں کے رہنے والے زیادہ تر یا تو گل ہوتے ہیں یا گل خاں یا صرف خاں کے حوالے سے زیادہ مشہور و معروف دکھائی دیتے ہیں۔

مختار مسعود جذیات نگاری ے حوالے سے بھی اسلوب میں قدرتِ تامہ رکھتے ہیں۔ وہ جہاں گئے جو دیکھا مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر اسے اپنی تحریر کا نہ صرف حصہ بنایا بلکہ تجزیاتی سطح پر تمام احوال ماضی، حال اور مستقبل کے رشتے اور سانچے میں قارئین تک منتقل کر دیا۔ ہر ادیب ارد گرد کے ماحول سے نہ صرف متاثر ہوتا ہے بلکہ اسے اپنی تحریروں کا حصہ بھی بناتا ہے۔ سفر نامہ کے اعتبار سے جہاں جہاں سے اس کا گُزر ہوتا ہے وہاں کے حالت کو بیان کرنا سفر نامہ نگار کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔ لیکن ایک اچھے سفر نامہ نگار ک لیے یہ ضروری امر ہے کہ وہ الفاظ کے ساتھ ساتھ منظر و ماحول کی منتقلی قارئین کے لیے معلومات کا ذریعہ اور

موجودہ دور میں ان علاقوں کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایسے بیان کرے کہ یہ تحریر پڑھنے والوں کے لیے ایک مکمل دستاویز کی حیثیت بن جائے۔

مختار مسعود کو اس بات کی ادائیگی میں ملکہ حاصل تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں اور بالخصوص سفر نصیب کے اعتبار سے مختلف علاقوں کی مقامی تہذیب و ثقافت، رہن سہن، لوگوں کا طرز عمل، ماحول، مخصوص کلچر دکھائی دیتا ہے۔ مختار مسعود کی اس انفرادی خصوصیت کے بارے میں ڈاکٹر نور الحسن جعفری لکھتے ہیں کہ:

''مختار مسعود کو جزئیات کا شوق ہے اور اب اس کا یہ شوق عشق کی درجہ اختیار کر چُکا ہے، اس کی غیر معمولی یاداشت نے تازنے کا کام کیا ہے۔ وہ سرکاری دورے پر گلگت گیا اس کو تمام سڑکوں کے نقشے تک حفظ تھے، کون سی چوٹی کتنی بلند ہے، کون قبیلہ کس علاقے میں آباد ہے سڑکوں کا طول و عرض کتنا ہے موجودہ سردار کا سلسلہ نسب کیا ہے۔''[۱۹]

مختار مسعود نے قبائلی علاقہ جات کے دورے کے دوران اپنی خُداداد صلاحیت کو بُروئے کار لاتے ہوئے جذیات نگاری کے فن کے ہمراہ اور اپنی غیر معمولی یاداشت کے سہارے وہاں کا ایسا نقشہ پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو ان علاقوں میں گھومتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ وہاں کے ظاہری خدو خال، پہاڑوں کی لمبائی چوڑائی، قبائل کا طرزِ زندگی، قبائل کے سربراہوں کا حال، نام، نسب موجودہ صورتحال اور مخصوص تاریخی و تہذیبی ربط کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس کا بیان ان علاقوں کی مخصوص زندگی، تہذیب و ثقافت کو اُجاگر کرنے کا باعث بنتا ہے۔

مختار مسعود نے مختلف علاقوں کی مقامی روایات، ثقافتی میلانات اور تہذیبی رویوں کے بارے میں قلمبند کرنے کے ساتھ ساتھ یہ سفر جاری و ساری رکھا اس دوران وہ دریائے کہنار کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس کی خوب صورتی اور اردگرد کے ماحول سے قارئین کو آگاہ کرنے کے بعد وادی کاغان کا رُخ کرتے ہیں۔ پاکستان کے قبائلی علاقہ جات میں شامل یہ خوبصورت اور سرد علاقے سیاحوں کی آمد اور دلچسپی کے حوالے سے مشہور ہیں۔ جھیل سیف الملوک کا تذکرہ کر بھی یہاں شامل رہا اور کشتی رانی کا حسین سفر بھی مختار مسعود کی یادوں کا حصہ رہا۔

مختار مسعود نے ان وادیوں اور پہاڑوں کی خوب صورتی کو رب العزت کا عطیہ قرار دیا ہے اور ان علاقوں کی خوش قسمتی حالانکہ ان علاقوں کے طبعی حالات اور سہولیات کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ علاقے کئی طرح کی سہولیات سے محروم ہیں، لیکن قدرت کے مناظر کی فراوانی، حسین ماحول اور سادگی، پہاڑوں کی بلندی اور درختوں کی خوبصورتی ان علاقوں کے حُسن میں اضافے کا باعث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملکِ پاکستان اور دیارِ غیر سے کئی لوگ ان علاقوں کا نہ صرف رُخ کرتے ہیں بلکہ یہ علاقے پاکستانی کلچر، تہذیب و ثقافت اور ان علاقائی و روایتی رہن سہن اور خوبصورتی کو پوری دُنیا میں متعارف کروانے کا باعث بنتے ہیں۔

مختار مسعود ان علاقوں کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ گبرال، شرینگل اور پھنڈر جیسے پہاڑی علاقوں سے بھی گُزرے اور ان کی تصویر کشی اپنے مخصوص اسلوب کے ذریعے بیان کی۔ وادی چترال اور وہاں کے رہنے والے لوگوں کا رہن سہن، مخصوص ثقافت کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں کہ:

"چترال کا دروازہ دیر ہے اور صحن سوات ہے، مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ دروازے اور صحن تک پہنچ جائیں اور پھر بھی گھر کے اندر داخل نہ ہوں۔ جن پہاڑوں پر اس وقت جہاز اڑ رہا ہے ان میں گھر بسانا بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ یہاں ایک سے زیادہ گھر بناتے ہیں۔ جب ایک گھر کو سردیاں فتح کر لیں تو دوسرے میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ وہاں پرانی عداوتیں نہ جینے دیں تو اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ جفاکش اور فاقہ مست ہوا کرتے ہیں، سربکف اور خانہ بدوش جیا کرتے ہیں۔ "[۲۰]

وادی چترال کی منظر کشی کرتے ہوئے مختار مسعود نے وہاں کے مقامی لوگوں کے رہن سہن کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ دیر، چترال کا دروازہ اور سوات صحن ہے البتہ یہاں کے موسم اور طبعی حالات کی وجہ سے یہاں کے رہنے والے دو دو گھر بناتے ہیں۔ جب شدید برفباری اور موسم کی سختی ایک گھر کو اپنی مکمل لپیٹ میں لیتی ہے تو یہاں کے رہنے والے مقامی باشندے اپنے دوسرے بنائے گئے گھر میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔

مختا مسعود نے ان مشکلات کے باوجود ان لوگوں کا تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے جفاکش قرار دیا ہے، یہ لوگ جفاکش اور فاقہ مست ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں گھر ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں، مختلف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں آپس میں پیوستہ ہیں۔ ان علاقوں اور یہاں کے حالات کا تذکرہ کرتے کرتے وہ سول سروس کے چند افسران اور اپنے قریبی ساتھیوں کو یاد کرتے ہیں جو دورانِ تربیت ان کے ساتھ رہے اور جن کا تعلق ان قبائلی علاقہ جات سے تھا۔

مختار مسعود کی تحریریں سیاسی، سماجی، تاریخی، تہذیبی و ثقافتی حوالے سے اہمیت کی حامل اور مکمل دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی کتاب ''سفر نصیب'' جہاں ایک سفر نامہ کی تصویر کشی ہے وہاں یہ دو اہم خاکوں پر مبنی حسین ادبی و نثری اصناف کے امتزاج کے ساتھ ادبی منظر نامہ میں ایک الگ و منفرد نوعیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر کے ایل حیدر اور فضل الرحمن کی شخصیات پر دو خاکے مختار مسعود نے اپنی کتاب ''سفر نصیب'' کا حصہ بنائے۔ قبائلی علاقہ جات کا سفر ہو یا دورانِ ملازمت مختلف سرکاری و اعلیٰ عہدوں پر فرائضِ منصبی کے سلسلے میں دیارِ غیر کی سیر ہو دونوں جگہ ذاتی ذوق اور شوقِ سفر نے حالات کو نہ صرف ایک ادیب بلکہ تاریخ دان کی حیثیت سے بھی ہر سطح پر، پرکھا اور اسے تحریر کے سانچے میں قارئین کے لیے ہمیشہ کے لیے ایک دستاویز بنا دیا ہے۔

مختار مسعود جیسی بلند فہم و فراست شخصیت و بیوروکریٹ جس سفر پر روانہ ہوتے وہاں کی تہذیب و ثقافت، مقامی کلچر اور رہن سہن کو بغور مشاہدہ کرتے وہاں کے رہنے والے باشندوں سے گفتگو، ملاقات اور مقامی سیاسی صورتحال کو پرکھتے ہوئے اسے تاریخ کے آئینے میں بیان کرتے اس طرح یہ کتاب ان مخصوص علاقوں کی تہذیبی و ثقافتی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے حوالے سے اہم ثابت ہوتی ہے۔

ب: تاریخی ادوار اور ان کا تجزیاتی جائزہ

مختار مسعود کی کتاب ''سفر نصیب'' میں بہت سی جگہوں پر تاریخی ادوار اور ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ مغربی تھیوری تاریخیت کے زیرِ اثر یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ایک فن پارہ اور فنکار یعنی ادیب تاریخ کے پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تاریخی شعور کے زیرِ سایہ کیسا متن تخلیق کرتا ہے۔ اس کے اثرات ماضی، حال اور مستقبل کے رشتے کے باہمی ربط سے کیسے منسلک ہوتے ہیں اور تاریخی واقعات کی نوعیت اور بیان موجودہ عہد میں کتنا اہم و ضروری ہے کہ جس سے قارئین کو تاریخ کے آئینے میں سوچنے اور مختلف زمانوں کے حوالے راہنمائی ملتی ہے۔

مختار مسعود چونکہ اپنی تحریروں اور تاریخ و تاریخی شعور کے حوالے سے قارئین کے لیے ایسا مواد پیش کرنے کا سبب بنتے ہیں جو گئی ممالک کی ارتقائی سیاسی صورتحال، جدوجہد، رویوں، رُجحانات اور تحریکات کا سبب بننے کے ساتھ ساتھ موجودہ عہد میں عصری آگہی رکھتے ہوئے تاریخی ادوار کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

مختار مسعود نے سفر کے دوران جہاں مختلف قبائلی علاقہ جات کا تذکرہ ان کی روایات ان کی مقامی تہذیب و ثقافت کا اُجاگر کیا ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے دیارِ غیر کی سیر اور مختلف سرکاری دوروں کے دوران ان ممالک کی تاریخی حیثیت ان کی سیاسی جدوجہد ان ممالک اور علاقوں کے موجودہ حالات و واقعات کو بخوبی بیان کیا ہے۔ مختار مسعود کے اسلوب اور ان کی تحریروں کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ہر حوالے سے مقامی تہذیب و ثقافت کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ذاتی ذوق و شوق اور تاریخ کے فہم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تاریخی حوالے پیش کرتے ہیں۔

مختار مسعود نے بطورِ سرکاری افسر اور بیوروکریٹ ادیب کے تاریخ کے بیان میں غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اسے پیش کیا ہے۔ تاریخ کا بیان اس سے راہنمائی آنے والی نسلوں کے لیے اہم دستاویز اور حوالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ تاریخ کے مطالعے سے علمی و ادبی مباحث، رویوں میں تبدیلی، انقلابات کی راہ ہموار ہونا، معاشروں میں تبدیلی اور قوموں کے عروج و زوال کی وجوہات سے آگاہی میسر آتی ہے۔ اسی کے

ساتھ ساتھ قومیں تقابلی سطح پر بھی علمی و ادبی اور سیاسی و سماجی صورتحال کے تحت اپنا سفر جاری و ساری رکھتی ہیں۔

اس اعتبار سے اور ان عوامل و مدِ نظر رکھتے ہوئے ''سفر نصیب'' اور مختار مسعود کی تحریروں کا مطالعہ تاریخی دستاویز اور بطورِ حوالہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو ہر طالب علم اور تاریخ کے قاری کے لیے معلومات کے ساتھ ساتھ دعوتِ فکر کا باعث بنتا ہے۔ تاریخی ادوار کے مطالعے اور مسلمانوں کے تاریخی شعور کے حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں کہ:

''دورِ جاہلیت کے تصور نے مسلمان معاشرے کے تاریخی شعور کو بڑا نقصان پہنچایا، کیونکہ اگر اس مفروضہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام سے پہلے دُنیا نے کوئی ترقی نہیں کی تھی، تو پھر ایک ایسے عہد کے مطالعہ کیا کیا فائدہ رہے گا جس میں اندھیرے اور تاریخی کے علاوہ کچھ بھی نہیں، اور جس عہد کی روایات و اقدار گمراہی کی وجہ سے انسانی ترقی و فلاح کے لیے قطعی مفید نہیں اور جس کے تمام علی و ادبی کارنامے کافروں و مشرکوں کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ اس لیے قدیم اقوام اور قوموں کی تہذیبوں کے بارے میں تحقیق و تجسس کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے اور ماضی کے لیے حقارت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ جو ہماری زندگی اور ذہنی ترقی میں ہمارے لیے کسی بھی طرح معاون نہیں ہو سکتی''[۲۱]

ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ اور تاریخی شعور کا تعلق اس کی اہمیت و افادیت بالخصوص مسلمانوں اور ان کے مطالعے کے ساتھ منسلک کرتے ہوئے اس کے دورس نتائج کو بیان کیا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ اور تاریخی شعور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اقوام کی ترقی اور زوال کو پرکھنا روشن اور کھُلے دماغ اور معاشروں کا کام ہے۔ اس کی تحقیق و جستجو، تجسس کی کسوٹی پر ماضی، حال اور مستقبل کے رشتے کو پروئے آئندہ کے لیے قوموں کا لائحہ عمل تشکیل دینے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

مختار مسعود نے اس حوالے سے جو واقعات اور ممالک کا تذکرہ کیا ہے ان کا مطالعہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ایشیائی ممالک کے اعتبار سے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ وہ دیارِ غیر میں سفر کرتے اس کی ترقی اور ماضی کے حالات یاد کرتے اپنے ملک کا تذکرہ اور تقابل بھی پیش کرتے ہیں۔ اس کی بنیاد پر وہ ایک تاریخ دان کی حیثیت

سے اور مورخ کے طور پر یہ سب کچھ بیان کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ مختار مسعود کا تاریخی شعور اور عصری آگہی اس حوالے سے بہت اہم تھی جس کی بدولت وہ ہر تحریر اور ہر بیان میں تاریخی اعتبار سے تجزیہ پیش کرنے میں کامیاب رہے۔

برصغیر کی تقسیم کا ذکر کرتے ہوئے تاریخی ادوار کا وہ دور پیش کیا گیا ہے۔ جب مہاجرین دونوں اطراف سے ہجرت کرتے ہوئے اپنے اپنے علاقوں اور قائم کردہ حدبندیوں کے مطابق پاکستان اور بھارت میں منتقل ہو رہے تھے۔ اس دوران بھی فسادات، لوٹ مار کا بازار گرم رہا اور امن و آمان کی صورتحال کشیدہ ہی رہی۔ ان حالات کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر ایل، کے حیدر نے اپنے سفر کی مختصر تصویر پیش کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ اُنھوں نے علی گڑھ سے سامان راولپنڈی بھیجا لیکن تقسیم کی بدولت جہاں سے سامان روانہ کیا تھا وہ بھارت میں رہ گیا اور جہاں سامان بھیجا وہ پاکستان کے حصے میں آگئی۔ مختار مسعود نے ڈاکٹر کے ایل حیدر کی زبانی یہ روداد لکھی کہ:

''ایک روز ڈاکٹر ایل کے حیدر ریلوے مال گودام پہنچے اور اپنا سامان بک کرایا۔ مال گاڑی کے دو ڈبوں میں سامان چڑھا، تالے لگے، اور مہر بند ویگنوں پر علی گڑھ تا راولپنڈی کا شناختی پرچہ لگایا گیا۔ سامان بک کیے ہوئے زیادہ دن نہ گذرے ہونگے کہ آزمائش شروع ہوگئی۔ یہ 1947ء کی بات ہے اور اس سال جس پیمانہ پر خوف بھوک جان مال اور میووں کے نقصان سے آزمائش ہوئی اس کا حال لکھتے لکھتے فرشتوں کی انگلیاں تھک گئیں۔ ڈاکٹر صاحب کھوٹہ پہنچ گئے اور سامان راستہ میں گم ہو گیا۔ جہاں سے سامان بھیجا تھا وہ جگہ ہندوستان میں رہ گئی اور جہاں بھیجا تھا وہ پاکستان میں شامل ہو گئی۔''[۲۲]

ان تمام حالات کی بدولت وہ کہتے ہیں کہ خراب صورتحال اور سیاسی منظر نامہ کی تبدیلی اور اس نتیجے میں پیدا ہونے والے سیاسی نظام، انقلاب میں معمولات کو کون پوچھتا ہے۔ پاکستان کے اقوامِ متحدہ کے رکن بننے کا تذکرہ بھی اس خاکے کا حصہ ہے۔ مختار مسعود نے ''سفر نصیب'' میں ''طرفہ تماشا'' کے نام سے سفر کی روداد قلمبند کی ہے یہ سفر دیارِ غیر کے ممالک کا سفر ہے نیو یارک کی سیر کے دوران کئی ممالک کی تہذیبی و ثقافتی

نمائشوں میں شرکت کا موقع ملا۔ نیویارک کی اس نمائش میں کئی ممالک کے پویلین، سٹالز لگائے گئے تھے جس سٹال پر مختار مسعود جاتے اس ملک کی تاریخی حیثیت، حالات وواقعات کو اپنی تحریر کا حصہ بناتے ہیں۔

مسئلہ فلسطین کا تذکرہ، کمبوڈیا، ویت نام کی جنگ، دوسری جنگِ عظیم، فسادات، ہجرت کے مناظر کئی ممالک کی سیاسی جدوجہد، تاریخ کے صفحات پر کئی ممالک کا آزاد ہونا اس کتاب کا حصہ ہے۔ مختار مسعود نے اپنی زندگی جوانی اور موجودہ دور تک کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی لکھا ہے کہ کئی مقامات پر آنکھوں کے سامنے وہ مناظر آجاتے ہیں جس میں جنگوں کے حالات، اس کے اثرات اور آزادی حاصل کرنے کے قصے شامل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"کوریا اور ویت نام کی جنگوں کے درمیانی وقفہ میں ساٹھ ملک آزاد ہوگئے، ساری آزادیاں خون میں نہائی ہوئی تھیں۔ لیکن لوگوں کی پیاس کم نہ ہوئی اس لیے داخلی جنگیں اور انقلابی جنگیں شروع ہو گئیں۔ جنگِ زرگری ان کے علاوہ تھی۔ تاکیو کی اس قصباتی بستی میں مسافر ایک نتیجہ پر پہنچا ہے۔ یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے۔ ساری راہیں میدانِ جنگ کی طرف جاتی ہیں۔ ہر سنگِ میل انقلاب کی منزل ہے۔ ہر آبادی ایک پکی ہوئی کھیتی ہے، اسے کاٹنے والے منڈیر پر تیار کھڑے ہیں۔"(۲۳)

مختار مسعود نے تاریخ کے صفحہ پر انقلابات، ان کے اثرات تاریخی ادوار کے دوران آزاد ہونے والے ممالک اور آزادی کے بعد ان ممالک کی اندرونی داستانوں کو جو فسادات، جنگوں لڑائی جھگڑوں اور مختلف مسائل پر مبنی تھی بیان کرتے ہوئے ان تاریخی ادوار کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔

مختار مسعود نے زندگی کے ہر موڑ پر جنگوں سے واسطہ پڑتا رہا محشر کی گھڑی اور اس کا عرصہ محشر دُنیاوی رنگ میں جگہ جگہ دکھائی دیتا رہا۔ مختلف آبادیاں دُنیا کے نقشے پر اُبھرتی رہیں اور ان آبادیوں کے ختم کرنے والے وقت کی رفتار کے ساتھ تیار کھڑے ہوتے ہیں۔ کیونکہ بقول مختار مسعود تاریخ کے آئینے میں ان لوگوں کی پیاس کم نہ ہوئی اس لیے ہر جگہ داخلی جنگیں اپنا زور دکھانے لگتی۔

مختار مسعود نے دیارِ غیر کے سفر کے دوران کئی ممالک کا سفر کیا کئی تہذیبی و ثقافتی اور فنونِ لطیفہ کے اعتبار سے سجائی جانے والی نمائشوں میں شرکت کی ان کا احوال پیش کیا اور ان تمام حالات کا تعلق اپنے تاریخی شعور کی بدولت تاریخی ادوار ان کا بیان اور تجزیاتی سطح پر بطورِ ادیب، بیوروکریٹ اور مورخ کے طور پر اسے اپنی کتاب کا حصہ بنایا، جو کہ ایک تاریخی دستاویز کا حصہ بن چکی ہے۔

اس دوران انھوں نے افریقہ کا سفر بھی کیا اور ایک جگہ نائیجریا کا تذکرہ کرتے ہوئے اس ملک کے مال و اسباب اور اس کی فراوانی کا ذکر کیا اور فراوانی معدنیات اور تیل کی کثرت دیکھتے ہوئے انگریزوں نے یہاں بھی برصغیر کی طرز پر جبری حکومت قائم کرنے کا اُصولی فیصلہ کی اور نائیجریا پر جنگ مسلط کر دی۔ مختار مسعود لکھتے ہیں کہ:

''مونگ پھلی کے تیل کی خاطر انگریز نے نائیجریا کو غلام بنایا۔ مدتوں خوردنی تیل اور غلاموں کی تجارت ہوتی رہی یہاں تک کہ عظیم برطانیہ دوسری جنگِ عظیم کے کولہو میں پس گیا۔ چار و ناچار اس نوآبادی کو بھی آزادی نصیب ہوئی۔ نصیب اچھے نہ تھے اس لیے بے وقت معدنی تیل دریافت ہو گیا۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ چاروں طرف سے یلغار ہو گئی اور ملک دونیم ہو گیا، بیافر اور باقیماندہ''(۲۴)

انگریزوں کی دیگر ممالک کی طرح مال و دولت اور حکمرانی کی ہوس اسے نائیجریا پر حملہ کرنے اور اس ملک کے وسائل لوٹ لینے کا ایک بار پھر موقع فراہم کرتی ہے۔ کچھ عرصے بعد اس نوآبادیاتی نظام کے کی زد میں رہنے والے کو آزادی ملتی ہے۔ لیکن چند وجوہات اور اندرونی خلفشار کی بدولت سے یہ ملک جنگوں اور لڑائی جنگوں میں ایک مرتبہ پھر گر گیا اور وقت کی بدلتی رفتار کے ساتھ دونیم ہو گیا بعد ازاں نائیجریا بیافر اور باقیماندہ کے ناموں سے سامنے آتے ہوئے دونیم ہو گیا۔

مختار مسعود نے اپنی کتاب ''سفر نصیب'' میں مختلف تاریخی ادوار، مختلف ممالک ان کی سیاسی و سماجی صورتحال کو بیان کیا ہے۔ کچھ ممالک کا تذکرہ کرتے ہوئے اُنھوں نے آنکھوں دیکھا حال بھی بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''میں نے تاریخ کی سب سے بڑی جنگ کو کئی برس بہت قریب سے دیکھا ہے۔ جتنی سیاہی جنگ کے بادلوں کی ہوتی ہے آپ اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ جنگ کے اندھیرے گھپ اندھیرے ہوتے ہیں۔ لیکن جتنی تیز اور خیرہ کرنے والی سفید روشنی سخت آزمائش کے دنوں میں زندہ قوموں اور باکردار افراد کے طرزِ عمل سے پیدا ہوتی ہے آپ اس کی طرف آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔ روشنی جب اتنی روشن ہو جائے کہ آپ اسے دیکھ نہ سکیں تو اسے نور کہتے ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے؛ کہیں آپ مجھ سے مل کر صرف اس لیے مایوس تو نہیں ہوئے کہ میں اب کہکشاں کے رنگین جھولے پر جھولنے کو زندگی کا مقصد سمجھنے کی بجائے اس کا زیاں سمجھتا ہوں۔ بے مقصد زندگی ناشکری ہے، زندگی کا زیاں گناہ ہے، میں گناہ سے بچنا چاہتا ہوں۔''(۲۵)

مختار مسعود نے ''سفر نصیب'' میں تاریخی شعور کی بدولت، کئی ممالک کی سیاسی و سماجی صورتحال تاریخ کے بدلتے ہوئے آئینے میں بیان کی ہے۔ ان حالات کی منظر کشی بھی کی ہے جو آنکھوں دیکھا حال کی صورت میں انھوں نے ملاحظہ فرمائی۔ انقلابات کا تذکرہ اس انداز میں کیا جہاں ہر طاقت ور فتح و تفاخر کی جذبات سموئے دوسرے کمزور ممالک کی خود مختاری کو مٹانے کے درپر ہے کیونکہ اسکی حوس مال و زر، معدنیات، ملکی وسائل اور بادشاہت کی سوچ ہے جس کے تحت طاقت ور انگریزوں نے برصغیر سمیت کئی ممالک میں اپنی نوآبادیاں قائم کی ان کے وسائل لوٹے اور تاریخ کے صفحات پر اپنا داغ دار تسلط قائم کرتے ہوئے اسے وسعت دی۔

ج: تقسیمِ ہند اور برصغیر میں دو قومی نظریہ (علمی و ادبی) اثرات

مختار مسعود کی تحریریں علمی و ادبی حوالے سے اہمیت کی حامل ہیں۔ قیامِ پاکستان سے قبل نوآبادیاتی نظام کے تحت برصغیر میں پروان چڑھنے والے نظریے کو سیاسی جدوجہد اور مسلم و ہند الگ نظریاتی سوچ کی بنا پر دو قومی نظریے کا نام دیا گیا۔ اس نظریے کی بنیاد الگ مذہب، زبان، کلچر تہذیب و ثقافت پر استوار تھی۔ سیاسی جدوجہد کی بنیاد انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارہ حاصل کرنا اور برصغیر میں اپنے مذہب، زبان اور تہذیب و ثقافت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آزادنہ زندگی بسر کرنا تھا۔

ان تمام عوامل اور اثرات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے برصغیر پاک و ہند کے اندر علمی و ادبی حوالے سے بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں اور ایسا ادب تخلیق کرنے کے حوالے سے روز دیا گیا جس کی بنیاد "ادب برائے اصلاح" جو بعدازاں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ نعرہ بنا، اس جانب توجہ مبذول کروائی گئی۔ دو قومی نظریے کو بنیاد بناتے ہوئے برصغیر کے اندر انگریزوں کے خلاف علمی و ادبی سطح پر آواز بلند کی گئی اور سیاسی جدوجہد میں ادیبوں، علماء اور دیگر لوگوں نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔

مختار مسعود نے علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران مختلف سیاسی عروج و زوال دیکھے۔ علمی و ادبی اُتار چڑھاو تاریخی اعتبار سے درپیش مسائل ان کے اثرات، فکری حوالے سے نئے زاویے اُجاگر ہونے کی صورت میں نوآبادیاتی نظام اور علی گڑھ کی صورتحال کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مختار مسعود نے ان عوامل، تبدیلیوں، اثرات اور علمی و ادبی حوالے سے دو قومی نظریے، سیاسی جدوجہد کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔

مختار مسعود نے برصغیر کے تناظر میں ان مشکل حالات کی منظر کشی، بھوک و افلاس کے دور میں فن کی تعمیر و ترقی اور سیاسی طور پر غلامی کی داستانیں ان کے اثرات ظاہری و باطنی دونوں سطحوں پر سامنے لاتے ہیں۔ ان تمام تر وجوہات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُس وقت کا تخلیق شدہ ادب بھی مختلف مراحل سے گُزرتا ہے اور نشیب و فراز سے گُزرتا ہوا مختلف اثرات لیتے ہوا ادب تخلیق ہوتا ہے۔ اس علمی و ادبی تبدیلیوں، اثرات اور سیاسی منظرنامے کی تبدیلی کو سامنے رکھتے ہوئے مختار مسعود نے لکھا ہے کہ:

"فن کا منبع فن کی روح ہے جب روٹی اور فن مل جاتے ہیں تو انسان تاج محل تعمیر کرتا ہے اہرام مصر بناتا ہے، الحمراء کے طلسماتی محلات کی بنیاد ڈالتا ہے۔ کالی داس شکنتلا، ملٹن گمشدہ جنت، اور اقبال جاوید نامہ لکھتا ہے۔ لیکن جب فن سے روٹی بچھڑ جاتی ہے تو شکنتلا مر جاتی ہے، جاوید نامہ ردی میں بکنے لگتا ہے پھر حُسن مر جاتا ہے مذہب مر جاتا، بھوک سب کا گلہ گھونٹ دیتی ہے۔"[۲۶]

انگریزوں کی برصغیر آمد، گھروں کا تباہ و برباد ہوتے ہوئے میدان کی شکل اختیار کرنا، اختیارات اور طاقت کا ناجائز استعمال، کانگریسی سوچ کو مسلمانوں پر زور زبردستی مسلط کرنا، بھوک و افلاس کا بازار گرم ہونا، قبضہ مافیا اور دیارِ غیر کی زبان بولنے والوں کی خیر خواہی ہونا ان تمام حالات میں علم و ادب کا عروج کیسے ممکن تھا؟ مختار مسعود نے کئی مشہور کلاسیکی و موجودہ یعنی قدیم و جدید دونوں کے امتزاج سے سیاسی منظرنامے کی تصویر کشی کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ بھوک و افلاس غُربت اور روٹی کے چھن جانے کے بعد ایسے فن پارے تخلیق ہونا ممکن نہیں رہا۔

مختار مسعود نے تحریکِ علی گڑھ کا احوال پیش کرتے ہوئے اس تحریک کے اغراض و مقاصد کو بیان کیا ہے۔ یہ تحریک سرسید تحریک کے نام سے بھی برصغیر پاک و ہند کی اہم علمی و ادبی تحریک کا درجہ رکھتی ہے۔ برصغیر میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ تین طبقات پیدا ہوئے ایک ایسا طبقہ تھا جو براہ راست طور پر انگریزوں کی مخالفت کرتا اور اس طبقہ کو مذہبی طبقہ بھی کہا جاتا رہا اس اعتبار سے اُنھوں نے انگریزوں کی شدید مخالفت کی اور برصغیر میں اس کی آمد اور جبری حکومت کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا، جبکہ دوسرا طبقہ مکمل طور پر انگریز کا طرف دار اور حمایتی رہا، یہی وجہ تھی کہ اس طبقے کو انگریزوں کی جانب سے انعام و اکرام سے نوازا جاتا رہا۔ تیسرا طبقہ سرسید احمد خان کی سوچ پر مبنی طبقہ تھا کہ انگریزوں کی آمد کی براہ راست مخالفت نہ کی جائے بلکہ اچھی اور جدید زمانے کے اعتبار سے تعلیم و تربیت حاصل کی جائے، جس کی بدولت اُنھوں نے تہذیبُ اخلاق بھی جاری کیا۔

برصغیر میں دو قومی نظریے کا فروغ اُردو ہندی تنازعہ کی روشنی میں بھی ہوا، الگ زبان، الگ مذہب، الگ تہذیب و ثقافت کی بنیاد پر علم و ادب کا تخلیق ہونا اور انگریزوں اور نو آبادیاتی نظام کے تحت جو غم و غصہ اور تاثر برصغیر کی اقوام میں موجود تھا اس کا ادبی اصناف میں اظہار ہونا وقت کی ضرورت تھا، لہٰذا اس دور کے علمی و ادبی مباحث میں نو آبادیاتی نظام کے حوالے سے تبدیلی رونما ہوئی اور ادب برائے اصلاح اور ترقی پسند تحریک کے منشور کو تقویت ملی۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ:

"سر سید کے موضوعات کی سنجیدگی، عبارت کی منطقی انداز اور عقلیت پر مبنی ذہنی رویہ انہیں باقاعدہ مقالہ یا مضمون بنا دیتا ہے۔ تہذیبُ الاخلاق میں سر سید اور ان کے تمام ہمنوا مضامین لکھتے تھے جس کے نتیجہ میں جلد ہی قارئین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا، جسے داستانی ادب کی صورت میں افیون کی ضرورت نہ رہی۔ یوں قومی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل پر لکھنے پڑھنے اور سوچنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ سر سید نے تہذیبُ الاخلاق کے آغاز میں لکھا، ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سولیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کی جائے تاکہ جس حقارت سے سولائزڈ یعنی مہذیب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دُنیا کی معزز اور مہذب قوم کہلا دیں۔"[۲۷]

برصغیر میں دو قومی نظریے کے زیرِ سایہ تخلیق ہونے والے ادب اور علمی و ادبی سطح پر رونما ہونے والے اثرات کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی کتاب "اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" میں سر سید احمد خان اور ان کی خدمات کے حوالے سے بھی یہی لکھا کہ دُنیا کی نظروں میں مسلمانوں اور برصغیر کی سیاسی و سماجی صورتحال کے پیش نظر مسلمانوں کی اصلاح ضروری تھی جس کو تہذیبُ الاخلاق کے اجراء کی صورت میں پورا کیا گیا۔ مضامین لکھے گئے اور مضمون نویسی کی صنف کو اُردو ادب میں عروج حاصل ہوا۔ اس کی ابتداء میں سر سید احمد خان کا خاص کردار رہا۔ داستانوی فضا کو ترک کرتے ہوئے حقیقت نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔

دو قومی نظریے اور اس کے زیرِ سایہ تخلیق ہونے والے ادب میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف آواز بلند کرنے کے ساتھ اپنے سیاسی و سماجی وجود اور ادبی تشخص کو پروان چڑھایا۔ کئی ادباء نے انگریزوں کے خلاف آواز اُٹھاتے ہوئے قومی و ملی یک جہتی کو پروان چڑھاتے ہوئے مشرق کی نمائندگی کی اور معاشرتی، فکری اور بالخصوص ادبی محاذ پر دفاع کی کوشش کی۔

برصغیر میں سیاسی و سماجی سطح پر انگریزوں کی مخالفت اور علمی و ادبی سطح پر اس نوآبادیاتی نظام کے اثر کو زائل کرنے کے لیے اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی، ظفر علی خان اور مولانا شبلی نعمانی نے اہم کردار ادا کیا۔ ان لوگوں نے انگریزوں کے سیاسی اثر و رسوخ کے خلاف آواز اور بغاوت کا علم بلند کرتے ہوئے علمی و ادبی سطح پر بھی اُردو اور مشرقی تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے میں اہم سنگِ میل ثابت ہوئے۔

انگریزوں نے اپنی آمد کے ساتھ ہی برصغیر کی اقوام کو یہ باور کروانے کی سعی کی اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ جو نظام لائے ہیں وہی جدید نظام اور بنیادی ضروریات سے ہم آہنگ ہے اس کی پیروی سے یہاں کی مقامی اقوام ایک مہذب قوم بن سکتی ہے اور اپنی فرسودہ روایات کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے برصغیر میں انگریزوں کی آمد اور اس کے اثرات علمی و ادبی اور سیاسی و سماجی صورتحال کے حوالے سے تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''انگریزوں کی حکومت برصغیر میں دو سو سال تک رہی۔ اس عرصے میں کا کچھ نہیں ہوا۔ حکومت گئی، خوش حالی رخصت ہوئی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اعتمادی جاتی رہی۔ ایک طرف انگریزوں کی طاقت تھی دوسری طرف پروپیگنڈا اور تیسری طرف پالیسی۔ اس سہ طرفہ حملے نے برصغیر کے باشندوں کو پہلے لوٹا مارا پھر نگاہوں کو خیرہ کیا اور آخر میں ذہنوں کو مسخر کر لیا۔''[۲۸]

مختار مسعود نے برصغیر کے تناظر اور انگریزوں کی آمد، اس کے دورس اثرات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جہاں تاریخی حوالے سے تجزیاتی جائزہ اپنی تحریروں میں پیش کیا وہاں پر ہی علمی و ابی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے اسے اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔ انگریزوں کی آمد سے جہاں برصغیر کے سیاسی و سماجی منظر نامے میں تبدیلی واقع ہوئی وہاں پر ہی نو آبادیاتی نظام کے زیرِ سایہ ادبی سطح پر انگریزوں نے اپنی زبان و ادب کے تسلط کو برقرار رکھنے کے لیے ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جو مقامی لوگوں میں انگریزوں کی محبت ان کی علمی و ادبی برتری کے لیے وسائل بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ محبت و شفقت کا رویہ مسلمانوں میں پیدا کرنے کا باعث بنے اس غرض سے کئی تعلیمی اداروں کا قیام اور کتابوں کے تراجم اور ایک خاص سوچ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عملی اقدامات اٹھائے گئے۔

مختار مسعود نے ان تمام اثرات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ان ادبی شخصیات کا تذکرہ بھی کیا جنھوں نے فوری طور پر انگریزوں کی اس عملی و ادبی سازش و برتری کا نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ مشرقی علوم کی بالا دستی اور مشرقی ادب کو پروان چڑھانے کے لیے کئی اصناف میں طبع آزمائی شروع کی۔

مختار مسعود کی تحریروں میں سیاسی و سماجی اثرات کے ذکر کے ساتھ ان کی کتاب ''سفر نصیب'' میں علمی و ادبی اثرات کو سیاسی نقطہ نظر بالخصوص دو اقوام کے طرزِ عمل اور سیاسی جدوجہد، دو قومی نظریے کے زیرِ سایہ بخوبی پیش کیا ہے۔ مختار مسعود کا اسلوب اور تاریخی شعور تاریخ کے آئینے میں ہونی والی تبدیلیوں، نو آبادیاتی نام کے زیر اثر انگریزوں کی آمد، برصغیر اور اُردو ادب میں اس صورتحال کے اثرات کا احاطہ کرتی ہیں اور ان حالات کا تجزیہ کرتی ہیں۔

حوالہ جات (باب دوم)

۱۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار، لاہور، ۱۹۷۳ء، صفحہ ۷

۲۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، صفحہ ۲۸۷

۳۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار، لاہور، ۱۹۷۳ء، صفحہ ۱۳

۴۔ ایضاً، صفحہ ۲۰

۵۔ ایضاً، صفحہ ۲۶

۶۔ روف پاریکھ، ڈاکٹر، کالم "لوحِ ایام پر نقشِ آوازِ دوست کا سفر نصیب ہوا" روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۹، اپریل ۲۰۱۷ء

۷۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار، لاہور۔ ۱۹۷۳ء، صفحہ ۳۳

۸۔ ایضاً، صفحہ ۲۴

۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو، پاکستان، اشاعت نہم، ۲۰۱۵ء، صفحہ ۲۹۰

۱۰۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار، لاہور، ۱۹۷۳ء، صفحہ ۳۰

۱۱۔ ایضاً، صفحہ ۴۰

۱۲۔ ایضاً، صفحہ ۶۷

۱۳۔ امر شاھد، صاحبِ آوازِ دوست (ترتیب و تدوین)، بُک کارنر، جہلم، ۲۰۱۷ء، صفحہ ۱۵۷

۱۴۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار، لاہور، ۱۹۷۳ء، صفحہ ۱۱۲، ۱۱۱

۱۵۔ ایضاً، صفحہ ۱۴۴

۱۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۸۶

۱۷۔ مختار مسعود، سفر نصیب، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار، لاہور، ۱۹۸۱ء، صفحہ ۲۳

۱۸۔ ایضاً، صفحہ ۲۸

۱۹۔ نور الحسن جعفری، ایک عکس مشمولہ ''منتشر یادیں'' مطبوعہ، انجمن ترقی اُردو، پاکستان، ۲۰۰۲ء، صفحہ ۱۳۲

۲۰۔ مختار مسعود، سفر نصیب، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار لاہور، ۱۹۸۱ء، صفحہ ۴۸،۴۷

۲۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور سیاست، تاریخ پبلیکشنز، اُردو بازار، لاہور، ۲۰۱۶، صفحہ ۴۸

۲۲۔ مختار مسعود، سفر نصیب، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار، لاہور، ۱۹۸۱ء، صفحہ ۱۴۵

۲۳۔ ایضاً، صفحہ ۱۴۲

۲۴۔ ایضاً، صفحہ ۱۸۲

۲۵۔ ایضاً، صفحہ ۳۱۷

۲۶۔ ایضاً، صفحہ ۳۱۲

۲۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸، صفحہ ۳۲۷

۲۸۔ محمد زکریا، خواجہ ڈاکٹر، اکبر الہ آبادی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶، صفحہ ۰۱

باب سوم

مختار مسعود کی تحریروں میں سماجی، ادبی اور ثقافتی عناصر

مختار مسعود کی تحریریں اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتی ہیں۔ان کی تحریریں جہاں مقامی طور پر تہذیب و ثقافت اور تاریخ کا آئینہ دار ہیں وہاں پر ہی یہ تحریریں بین الاقوامی سطح پر تاریخ سے منسلک رہتے ہوئے مختلف ممالک کے سیاسی و سماجی حالات وواقعات اور انقلابات کے گرد رہتے ہوئے وہاں کی سیاسی صورتحال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مختلف تہذیبی و ثقافی اور بعد ازاں ادبی اثرات کے مطالعے کا باعث بنتی ہیں۔

مختار مسعود نے بطورِ بیورو کریٹ مختلف ذمہ داریوں کے ہمراہ مختلف علاقوں اور ممالک کا سفر کیا اس دوران انہیں مختلف ممالک میں قیام بھی کرنا پڑا۔ قیام کے دوران انھوں نے ان ممالک کی سیاسی و سماجی صورتحال کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ دورانِ قیام اور سرکاری منصب کے مختلف حکومتوں کے عروج و زوال کے اسباب بھی دیکھے ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے مختار مسعود نے اپنے تاریخی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے اسی تحریری صورت میں محفوظ کرتے ہوئے تاریخی دستاویز کی حیثیت عطا کی اور انہیں اپنی کتابوں کا حصہ بنایا۔

مختار مسعود نے جہاں ''آوازِ دوست'' اور ''سفر نصیب'' تحریر کرتے ہوئے سیاسی ،سماجی اور تہذیبی و ثقافتی عناصر اور تبدیلیوں کو اپنی تحریروں کا حصہ بناتے ہوئے اسے قارئین تک تاریخی اعتبار سے بیان کیا ہے وہاں پر مختار مسعود نے دورانِ ملازمت اور بطورِ آر سی ڈی کے سربراہ کی حیثیت سے ایران میں چار سالہ قیام کے دوران جن حالات وواقعات اور بالخصوص انقلابِ اسلامی (انقلابِ ایران) کو چشم دید گواہ کی حیثیت سے دیکھا اسے اپنی کتاب ''لوحِ ایام'' کی صورت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کیا۔

قیامِ ایران کے دوران سیاسی و سماجی حوالے سے عروج و زوال کی داستان مختار مسعود نے ایک سفر نامہ کی صورت میں تحریر کی ہے جس کو بعد میں ''لوحِ ایام'' کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں انقلابِ

اسلامی (انقلابِ ایران) کے دوران پیش آنے والے حالات و واقعات، ایران کی سیاسی و سماجی صورتحال اور اس کے اثرات کا اجمالی جائزہ مختار مسعود نے پیش کیا ہے۔

ا۔ لوحِ ایام

مختار مسعود کی کتاب "لوحِ ایام" کی اشاعت ۱۹۹۶ء جنوری میں ہوئی۔ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ مختار مسعود کی تیسری کتاب "لوحِ ایام" منظرِ عام پر آئی۔ صنفِ ادب کے اعتبار سے یہ کتاب سفر نامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مختار مسعود بطورِ بیورو کریٹ اور سرکاری اعلیٰ عہدے دار مختلف فرائض سرانجام دے چکے ہیں۔ ان کی صلاحیتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے انہیں آر-سی-ڈی کے سربراہ یعنی علاقائی تعاون کی تنظیم کے سرپرست کی صورت مین تعینات کیا گیا۔ جس کے لیے انہیں پاکستان سے ایران کے شہر تہران منتقل ہونا پڑا۔

ایران کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کا از سر نو مطالعہ کیا جائے تو یہاں زمانہ قدیم سے بادشاہت کے زیرِ اثر حکومت قائم تھی جس کو رضا شاہ پہلوی کی قیادت میں ایران کے اندر حکومت کرنے کا موقع ملا۔ اس بادشاہت اور حکومت کے عروج و زوال کے دوران مختار مسعود نے چار سال کا عرصہ جو ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء کے دوران بنتا ہے ایران میں قیام کیا اور ان بدلتے حالات اور بعد ازاں انقلابِ ایران کو اپنی یاداشت کا حصہ بناتے ہوئے کتابی صورت میں شائع کروایا۔

مختار مسعود نے چار سالہ قیام کے دوران اپنے فرائضِ منصبی کو نبھاتے ہوئے چشم دید گواہ کی حیثیت سے جن حالات و واقعات کو بغور دیکھا انہیں اپنی تحریر "لوحِ ایام" کا حصہ بنایا۔ یہ کتاب ایک تاریخی سرمایہ اور دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں انقلابِ اسلامی (انقلابِ ایران) ۱۹۷۹ء میں بادشاہت کے خاتمہ اور رضا شاہ پہلوی کے جلا وطن ہونے کے ساتھ ساتھ آیت اللہ خمینی کی قیادت اور تعلیمات کی روشنی میں رونما ہونے والے انقلاب کی داستان بطورِ چشم دید گواہ رقم کی گئی ہے۔

مختار مسعود نے اس کتاب میں اسلوب کے اعتبار سے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے روابط حالات وواقعات اور تہذیبی و ثقافتی سطح پر ان کے تعلق کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا ہے۔ تحریکِ علی گڑھ اور قیامِ علی گڑھ کی وابستگی ان کی تحریروں کا خاصا ہے لہٰذا ایران کے حالات وواقعات کو تحریر کرتے ہوئے اُنھوں نے برصغیر پاک وہند کی سیاسی وسماجی اور ادبی صورتحال کو بھی ساتھ ساتھ تقابل کی صورت میں پیش کیا ہے۔

مختار مسعود نے اپنی پہلی دو کتب کی طرح اس کتاب میں بھی تہذیب و ثقافت، تاریخی واقعات، علم و ادب، مقامی حالات اور انقلابِ ایران کو تاریخی اعتبار سے بخوبی پیش کیا ہے۔ان حالات کو تین عنوانات ''شاہنامہ''، ''آمدنامہ''اور'' منظرنامہ'' کے عنوانات کے ساتھ تقسیم کرتے ہوئے ہر عنوان کے ذیلی اجزاء پر تحریر کیا ہے۔ دیگر کُتب کے اعتبار سے ''لوحِ ایام'' ایک ضخیم کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ موضوع کے لحاظ سے اس کتاب کو انقلابِ اسلامی یا انقلابِ ایران کی روداد بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن صنف کے اعتبار سے سفرنامہ کی حیثیت حاصل ہے۔

مختار مسعود نے جن سیاسی وسماجی تبدیلیوں کا تذکرہ ''لوحِ ایام'' میں قلمبند کیا ہے وہ تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ایران کی سیاسی وسماجی تبدیلیوں، صورتحال کے ساتھ ساتھ عروج وزوال، ایران کی معاشی و معاشرتی و تبدیلیوں اور اس کے دیگر خطوں پر اثرات کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

الف: سیاسی وسماجی تبدیلیوں کا مطالعہ

مختار مسعود کی تحریریں اپنے مخصوص اسلوب کے ہمراہ سیاسی وسماجی تبدیلیوں کا احوال پیش کرتی ہیں۔ مختار مسعود نے آر-سی-ڈی کے سربراہ کی حیثیت سے کارہائے منصبی کے دوران ایران کی بدلتی صورتحال، سیاسی اور حکومتی اعتبار سے عروج وزوال کے اسباب اس کے پیشِ نظر ہونے والی سیاسی وسماجی تبدیلیوں کو بغور دیکھتے ہوئے اپنے تاریخی شعور کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔

مختار مسعود کی کتاب ''لوحِ ایام'' ان سیاسی و سماجی تبدیلیوں کا آئینہ دار اور عکاس ہیں جو اُنھوں نے قیامِ ایران کے دوران اپنی آنکھوں سے دیکھا اسی لیے مختار مسعود نے ''لوحِ ایام'' کے دیباچہ میں ان تبدیلیوں اور انقلاب کے ساتھ ساتھ اس کتاب کے قلمبند کرنے کے حوالے سے بھی اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اس کتاب کو لکھنے میں اتنا وقت نہیں لگا جتنا یہ طے کرنے میں کہ لکھا جائے یا نہ لکھا جائے۔ اور اگر لکھا جائے تو اس کی حد بندی کیسے کی جائے۔ وجہ معلوم کرنے کے لیے آپ کو کتاب پڑھنی ہو گی۔ اسکے بعد گریباں میں جھانکنا ہو گا۔ اگر وہ سلامت نظر آیا تو گویا انقلاب کے موضوع پر لکھنے کا فیصلہ کچھ ایسا درست نہ تھا۔ انقلاب خواہ کتنا ہی پُرانا کیوں نہ ہو جائے اسکی داستان ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔ اُمید اور عمل، بیداری و خود شناسی جنون اور لہو کی داستاں بھی کہیں پُرانی ہو سکتی ہے۔ زمانہ اس کو بار بار دُہراتا ہے فرق صرف نام، مقام، اور وقت کا ہوتا ہے۔''(۱)

مختار مسعود نے ''لوحِ ایام'' کے دیباچہ میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ تحریریں انقلاب کے پر فتن دور کے اندر رہتے ہوئے تحریر کی گئی ہیں۔ لیکن ان کو لکھنے سے قبل یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ ایسے موضوع پر قلم فرسائی ہو یا نہیں البتہ انقلاب کا موضوع کبھی قدیم یا پُرانا نہیں ہوتا، اس کی کہانی ہمیشہ تازہ اور پڑھنے والوں کے لیے تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ انقلاب کی داستان کئی سیاسی و سماجی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

یہاں عوام و خواص کے جذبات، اعمال اور عملی سطح پر ان کی حکمرانی کی بات ہوتی ہے۔ ان کا رویہ ایک رُجحان کی صورت اختیار کرتا ہے، جو بعد ازاں ایک مکمل تحریک کا درجہ حاصل کرتے ہوئے بڑی تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ اس تبدیلی کے لیے عوام و خواص دونوں کا مشکلات، تکالیف اور نقصانات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے اور کئی قربانیوں کے بعد یہ انقلاب و تبدیلی وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ بادشاہوں کا طرزِ زندگی اور عوام کی خواہشات اور ترجیحات کا خون ہونا لازمی امر تھا، جس کو مختار مسعود نے بیان کرتے ہوئے تمام صورتحال سے آگاہی فراہم کی ہے کہ:

''قطع نظر اس کے کہ ملک، زمانہ اور خاندان کون سا تھا، ایک بار تیر اندازی کی مشق کرتے ہوئے بادشاہ کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے تختہ مشق کہ جگہ تقریباً ایک لڑکے کو کھڑا کیا اور اس کے باپ کی آنکھوں کے سامنے نشانہ اڑا دیا۔ لڑکا ہلاک ہو گیا۔ خوف زدہ باپ نے بڑھ کر قدم چومے اور بادشاہ کی نشانہ اندازی پر اسے مبارک باد پیش کی۔ زبردست مارتا ہے اور رونے نہیں دیتا۔ بادشاہ مارتا ہے اور پسماندگان سے مبارک باد وصول کرتا ہے۔''(۲)

مختار مسعود کے نزدیک تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے زمانہ واپس پلٹ کر ظلم و ستم کا خاتمہ ایک دن ضرور کرتا ہے۔ جبر و تشدد سے انا و اطاقت کے بل بوتے پر چلنے والی حکومتیں زیادہ عرصہ اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتیں ایک دن انہیں عوامی طاقت سے وجود میں آنے والی تحریکوں سے شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے انقلاب آتا رہتا ہے صرف نام، مقام اور وقت کا فرق ہوتا ہے۔ یہی فرق ایران کی سیاسی و سماجی صورت حال میں دیکھا گیا ہے۔ جس کو مختار مسعود نے اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔

اس بدلتی صورتحال کو بہت سی وجوہات پر گردانہ جا سکتا ہے۔ طاقت اور انانیت کا استعمال عوامی جذبات کو ٹھیس پہچانا اور ان کی خواہشات کو بزور طاقت منہدم کرنا طبقاتی کشمکش کا عملی نمونہ ثابت ہوا جہاں بادشاہت کے پیروکار حکمران اور عوام دونوں آمنے سامنے آ چکے ہیں اس طبقاتی کشمکش کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ:

''دُنیا میں نادار اور زردار طبقوں کے درمیان تصادم مفادات کے باعث جو آویزش جاری ہے اسے اشتراکی مصنفین کی اصطلاح میں طبقاتی کشمکش کہا جاتا ہے۔ طبقاتی کشمکش کی بنیاد اگرچہ معاشی عدم مساوات پر ہے لیکن اس کا اظہار اقتصادی میدان کے علاوہ سیاسی کشمکش اور نظریاتی آویزش کی صورت میں بھی ہوتا ہے۔''(۳)

ایران کی بدلتی سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کو بیان کرتے ہوئے مختار مسعود نے اسے تاریخ کے تسلسل سے منسلک کرتے ہوئے تاریخی پسِ منظر کے ساتھ جوڑا ہے جہاں ایسے معاملات دُنیا بھر میں دکھائی دیتے ہیں جہاں طبقاتی کشمکش کا شکار معاشرے جنگ و جدل، انتشار و بدامنی فسا کی فضاء کے بعد ایک انقلابی رنگ میں پروان چڑھتی ہے اور بڑی سیاسی و سماجی تبدیلیاں آشکار ہوتی ہیں۔ یہی صورتحال ایران کی سرحدوں پر بھی دکھائی دیتی ہے جہاں عرصہ دراز سے قائم رہنے والی بادشاہت اور رضا شاہ پہلوی کی حکومت طاقت و جبر کا عملی نمونہ ہے جبکہ عوامی

جذبات، توقعات اور ہر جانب سے احتجاج کے باوجود وہ منصب چھوڑنے کے لیے تیار نہیں اس تمام صورتحال کے پیشِ نظر ایران بھر میں احتجاج، ہڑتال، جلاو گھیراو، فساد و بدامنی کا دور دورہ ہے خوف کی فضاء کا راج پورے ایران وبالخصوص تہران میں چھایاہوا ہے۔

''محمد رضا شاہ کے پہلے اور دوسرے دورے میں چند سال کا وقفہ ہے۔ پھر یہ وقفہ بہت کم ہو گیا اور جلالت مآب بڑی باقاعدگی کے ساتھ آنے جانے لگے۔ ہر بار ان کا قیام طویل ہوتا گیا اور تکلفات کم ہوتے چلے گئے۔ ان کے خاندان کے دو افراد جو پہلے ان کے ہمراہ آنے کی وجہ سے نظر انداز ہو جاتے تھے انہوں نے بھی علاحدہ علاحدہ آنا شروع کر دیا۔''(۴)

یہ تمام صورتحال کسی بڑے انقلاب اور بڑی سیاسی و سماجی تبدیلی کو دعوت دیتے ہیں۔ ایران کی اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے مختار مسعود نے برصغیر کی سیاسی و سماجی صورت حال کے ساتھ نہ صرف اس کا تقابل کیا ہے بلکہ اپنے تاریخی شعور کی بدولت اس صورتحال کے پیدا ہونے کے اسباب کا بغور مشاہدہ بھی کیاہے اور اس صورتِ حال کا شکار اور وجہ عوام کو بھی قرار دیاہے۔ جو ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرنے میں دیر کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں۔ غفلت کی وجہ سے یہ نظام اپنے قدموں پر کھڑا ہو جاتاہے پھر کسی بیرونی خدشے اور خطرے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اس بارے میں مختار مسعود لکھتے ہیں کہ:

''ایران کی تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں عروج کی وجوہات کے علاوہ زوال کے اسباب کا پتا بھی چلتاہے۔ ظلم ہو اور انصاف نہ ملے۔ رشوت چلے اور حق دار کو اس کا حق نہ ملے۔ اخلاق پست ہو جائیں اور صحت تباہ۔ لوگ لذات میں کھو کر مستقبل سے غافل ہو جائیں۔ اس کے بعد تمہیں کسی دشمن کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تم خود ہی اپنے سب سے خطرناک دشمن بن جاتے ہو۔ مجھے اس آئینہ میں اپنی صورت نظر آرہی ہے۔''(۵)

تاریخی اعتبار سے ایران قدرتی وسائل سے مالا مال ملک مانا جاتا تھا تیل کی فراوانی پوری دُنیا کے لیے مرکزِ نگاہ بنی رہتی درآمدات و برآمدات اور معاشی طور پر ایران ایک مستحکم مملکت کہلاتا تھا۔ لیکن ان تمام وسائل کی فراوانی کے باوجود اندرونی طور پر حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ ظلم و ستم، رشوت خوری، حقوق کی پامالی، عیش و عشرت کی غفلت میں مبتلا ہونے کے باعث یہ مملکت عروج حاصل کرنے کے بجائے زوال اور تنزلی کی جانب گامزن ہوتی چلی گئی۔

اس تمام صورتحال میں مختار مسعود کے نزدیک کسی بیرونی دشمن کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ ایسی اقوام جو ظلم و ستم، فساد، لڑائی، انصاف کی عدم فراہمی، معاشی و معاشرتی استحصال، طبقاتی کشمکش، سیاسی عروج و زوال اور اس حوالے سے مغلیہ سلطنت اس کی عیش و عشرت، دولت کی فراوانی، وسائل کی بھرمار اور عہدوں، مرتبوں اور حکمرانوں کا طرزِ رہن سہن یاد آتا ہے، جو مذہب، سماجیات اور معاشرت کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے جس طرح کے لوازمات میں مبتلاء ہو چکے تھے زوال ان کا مقدر تھا۔ محمد حمید شاہد اپنے ایک مضمون میں مختار مسعود کے سفر اور بالخصوص ایران میں قیام اور ''لوحِ ایام کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

''سول سرونٹ مختار مسعود ان خوش بخت لوگوں میں سے ہیں جو ملکوں ملکوں گھومے، شہر، دیہات سب دیکھا، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا مگر اپنے فن کو اُجالے رکھا، اپنی زمین سے محبت کی اور اپنے افکار کو پراگندہ نہیں ہونے دیا۔ جن دنوں وہ آر سی ڈی کے سیکڑی جنرل ہو کر تہران میں تب انھوں نے رضا شاہ پہلوی کے اقتدار کا سورج ڈوبتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جو دیکھا اور محسوس کیا وہ ''لوحِ ایام'' کا حصہ ہو گیا ہے۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ کتاب اڑھائی ہزار سال پرانے زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ ماجرا وقت کی اوبڑ کھابڑے راہوں کو پھلانگتا اُس شہنشاہ تک پہنچتا ہے جس کا زوال مختار مسعود نے دیکھا اور تاریخ کی ایک خاص دھج سے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔''(۲)

محمد حمید شاہد نے مختار مسعود کے دورانِ ملازمت اور قیامِ ایران کو خوش بختی قرار دیا ہے کہ اس مقصد کے لیے مختار مسعود نے انقلابِ ایران (انقلابِ اسلامی) کے اسباب و اثرات کو عینی شاہد کے طور پر دیکھا اور اسے ''لوحِ ایام'' کا حصہ بنایا۔

وہ انہی حرکات کی وجہ سے بادشاہت سے غلامی میں دھکیل دیے گئے یہی صورتحال ایران کے سیاسی وسماجی پسِ منظر میں اُبھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جس کو مختار مسعود نے ایران میں بڑی سیاسی وسماجی تبدیلی کا سبب قرار دیا ہے۔

پاکستان اور ایران کی بدلتی سیاسی صورتحال پر جہاں مختار مسعود نے تقابلی مطالعہ کی فضاء قائم رکھتے ہوئے دونوں ریاستوں کے سربراہان کے طرزِ حکمرانی پر گہرا طنز کیا ہے وہاں پر ان کی ملاقات کا احوال ایک بڑی سیاسی تبدیل کا پیش خیمہ پاکستانی سیاست میں سامنے آیا جب غلام محمد اور رضاشاہ پہلوی کی ملاقات ہوئی تو مختار مسعود نے دونوں کے طرزِ حکومت اور ناجائز اختیارات کے استعمال پر طنز کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ سال سوا سال کے بعد وہ ملک کی سب سے اہم اور طاقتور شخصیت بن جائیں گے اپنی اہمیت کا غلط اندازہ لگائیں گے۔ اپنی طاقت کا غلط استعمال کریں گے اپنے نام کا دروازہ بنوائیں گے۔ اس نئے اور کشادہ دروازہ سے عارضی دستور، آئین ساز اسمبلی کم سن جمہوریت اور دو چار حکومتوں کا جنازہ نکلے گا۔ غلام محمد نے رضاشاہ پہلوی سے ہاتھ ملایا کل کے بے تاج بادشاہ نے آج کے تاجدار سے مصافحہ کیا۔''[۷]

مختار مسعود نے ایران کی بدلتی صورتحال کا موازنہ پاکستانی سیاسی صورتحال کے ساتھ کرتے ہوئے غلام محمد اور رضاشاہ پہلوی وقت کے بادشاہِ ایران کی ملاقات کا احوال قلمبند کیا ہے۔ پاکستانی سیاسی صورتحال بھی آزادی سے لے کر کئی عشروں تک زیادہ مستحکم نہیں رہی کبھی جمہوریت کے نام پر کبھی آمیریت کے نام پر حکومتیں بنتی اور گرتی رہتی، اس کے اثرات نہ صرف مقامی سطح پر رونما ہوئے بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اس کے دورس نتائج بر آمد ہوتے۔ درحقیقت حکمرانوں کی ترجیحات میں عوامی مفادات کی شمولیت اور ان کا تحفظ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے دیرپا اور مضبوط حکمت عملی اور خارجہ اور اندرونی پالیسوں کا فقدان ہر دور میں دکھائی دیتا ہے۔ جس کی بدولت نقصان مملکتِ پاکستان کا ہوتا ہے نا کہ چند حکمرانوں اور گھرانوں کا، مال واسباب اور حکمرانی ہی ہوس نے کئی لوگوں کو بے نقاب کیا اور کئی عشروں تک ان کی جبری حکمرانی سے عوامی خواہشات اور توقعات کا خون ہوتا رہا انہیں ذلت ورسوائی کا سامنا رہا۔

یہ صورتحال ان دنوں ایران کی فضاؤں میں مسحور کن ہے۔ جہاں بادشاہت پر قائم رہنے والی حکومت، اور رضا شاہ پہلوی کے اقتدار کی تبدیلی، برطرفی اور جانے کے قیصدے ایران کے شہریوں کی زبانوں پر عام ہیں۔

مختار مسعود نے اپنے قیام کے دوران ان معاملات کا نہ صرف جائزہ لیا، بلکہ تاریخ کے آئینہ میں اسے اپنے تاریخی شعور کی بدولت پر کھا، ایران کے وسائل کی بھرمار، دولت کی فراوانی اور ہر طرح سے آسودگی تو موجود رہی لیکن ایک جانب عوام کے احساسات و جذبابت کی الگ آگ بھڑک رہی تی یہ آگ اُن لوگوں کی تھی جو رضا شاہ پہلوی کے اقتدار کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ دولت کی یکساں تقسیم، اخلاقیات کی بلندی اور بڑی سیاسی و سماجی تبدیلی کے خواہش مند تھے اس رویہ کو وقت کے ساتھ ساتھ تقویت ملتی گئی۔

مختار مسعود نے ان رویوں کا مطالعہ کیا اور ”لوحِ ایام“ میں انقلاب کی صورت میں اس کی بشارت دی کہ اگر یہ رویہ تحریک کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو انقلاب کی راہ ہموار ہو جائے گی اور ایران میں یہ سیاسی تبدیلی وقوع پذیر ہو گی جو بعد ازاں حقیقت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ مختار مسعود اس تبدیلی کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

”ایک دیگ جو میں ایران میں اپنے قیام کے آغاز میں ابلتے ہوئی دیکھی ہے۔ وہ بے پناہ دولت، بے فکر جوانی اور بے چین الیکٹرانک موسیقی کی شب دیگ ہے۔ ایک دوسری اور بڑی سی دیگ بھی ہے۔ دولت سے محروم، ظلم سے عاجز، بے اختیار اور بے آواز لوگوں کے جذبات کی دیگ ہے۔ کھد بد اس میں بھی ہو رہی ہے۔ نہ جانے کب ابل پڑے یا پھٹ جائے۔ اُبلی تو اصلاحات، پھٹی تو انقلاب۔ “[۸]

ان بڑی سیاسی و سماجی تبدیلیوں کے اثرات مقامی سطح پر بڑھتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے جس کو دیکھتے ہوئے مختار مسعود نے اسے مستقبل میں ایران کی سیاست میں بڑی تبدیلی جو انقلاب کی صورت میں رونما ہوئی اس کا پیش خیمہ قرار دیا۔ تاریخ کے اندر ایسے کئی حکمران گزرے ہیں، جو ظلم و ستم، جبر و تسلط اور بادشاہت و حکمرانی کو طول دینے کے لیے عوامی ترجیحات، عوامی احساسات و جذبات اور ان کی خواہشات کو پامال کرتے ہوئے اپنے دورِ حکومت کو طول دیتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک دن ان جابر حکمرانوں کا تختہ ضرور اُلٹ جاتا ہے

اور وہ دیارِ غیر اور غریب الوطنی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بیوروکریٹ کی حیثیت سے مختار مسعود نے کئی ممالک کا دورہ کیا، وہاں کی سیاسی و سماجی صورتحال کو دیکھا، پرکھا اور انہیں اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔

مختار مسعود نے ان تجربات اور دورانِ فرائضِ منصبی ان کو جن ممالک کا دورہ کرنا نصیب ہوا جو ان کے لیے سفر نصیب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان تمام معاملات کو انھوں نے تاریخی شعور کی بدولت اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔ یہ کتاب کئی صدیوں پر محیط تاریخی داستان ہے۔ جہاں کئی حکمران جلوہ گر ہونے کے ساتھ ساتھ زوال کا شکار ہوئے۔ وقت اور تاریخ کا کھیل جاری و ساری رہا۔ یہاں تک کہ شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی کے اقتدار اور بادشاہت کا سورج غروب ہوا اس منظر کی تصویر کشی مختار مسعود نے "لوحِ ایام" میں کی ہے جو ایران کی تاریخ میں بڑی سیاسی و سماجی تبدیلی کہلاتی ہے۔

اس سیاسی و سماجی تبدیلی کے کئی اسباب بھی سامنے آتے ہیں اور انقلابِ اسلامی کے بعد رونما ہونے والے اثرات بھی بڑی شدت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ مختار مسعود نے ان تمام حالات و واقعات کو اپنی تحریروں کا حصہ بناتے ہوئے اسے ایک مکمل تاریخی دستاویز کی حیثیت قرار دیا ہے۔ جو ہر نسل کے قارئین کے لیے تاریخ کے تسلسل اور تاریخی و سیاسی تبدیلیوں کا گواہ اور عینی شاہد ثابت ہو گا۔

ب: تحریکِ علی گڑھ اور لوحِ ایام کا فکری جائزہ

"علی گڑھ تحریک" سے "لوحِ ایام" تک کا سفر مختار مسعود کی زندگی اور تجربات کا نچوڑ ہے۔ علی گڑھ تحریک کو تحریکِ پاکستان اور اس تحریک کے نتیجے میں ملنے والی آزادی، پھر پاکستان کا قیام مختار مسعود نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر اس تمام قصے کو اپنی قلم کے سپرد کر دیا۔ شاید یہ تمام حالات و واقعات مختار مسعود کے ذہن پر کچھ یوں ثبت ہوئے کہ انقلابِ ایران کے دوران پیش آنے والے واقعات کے سرے وہ علی گڑھ تحریک کے ساتھ نہ صرف جوڑتے ہیں بلکہ دونوں واقعات کا تقابل بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ایک قوم انگریزوں سے آزادی چاہتی تھی اور الگ مذہبی اور معاشرتی وسیاسی تشخص چاہتی تھی جبکہ ایک قوم اپنے نظامِ جبر و بادشاہت سے تنگ آتے ہوئے اپنے مسلط بادشاہ رضا شاہ پہلوی سے آزادی کی طلب گار ہے۔ دونوں حالات کا تقابل کیا جائے تو مسلط نظام ظلم و ستم، عیش و عشرت، لڑائی و جھگڑے اور فسا، دولت کی غیر مساوانہ تقسیم و استعمال، غیر مساوانہ سلوک، طبقاتی کشمکش، اور ان جیسے منفی عوامل دونوں ممالک اور نظامِ حکومت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

ان حالات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مختار مسعود تحریکِ علی گڑھ اور ''لوحِ ایام'' کا تقابل کرتے ہوئے حالات کو بیان کرتے ہیں۔ فکری اعتبار سے ''لوحِ ایام'' عصرِ نو اور مستقبل کے لیے ایک تاریخی اثاثہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں ماضی، حال اور مستقبل کے رشتے سے نئے سیاسی نظام، اخلاقیات و اقدار، بادشاہت کا خاتمہ، جمہوری رویوں کا فروغ، نصب العین کی صورت میں اُجاگر ہوتا ہے۔

مختار مسعود نے برصغیر اور ایران میں غیر ملکی مداخلت اور انگریزوں کے اثرورسوخ پر بات کرتے ہوئے ان کی ترجیحات سے آگاہی فراہم کی ہے کہ یہ ممالک ترقی پذیر ممالک کے لیے کیسے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں اور انہیں ایک خاص پالیسی کے زیرِ اثر جینے کا موقع دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ترقی یافتہ دُنیا کی سیاسی، معاشی، تجارتی اور مالیاتی گرفت اتنی مضبوط ہے اور وہ لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی میں اتنے آگے نکل چکے ہیں کہ کسی ترقی پذیر ملک کے لیے نہ یہ ممکن ہے اور نہ ہی یہ اس کے حق می ہے کہ وہ اپنے کثیر المقاصد بڑے بڑے منصوبوں کو تنہا مکمل کرے، کوشش یہ ہونی چاہیے کہ عقلمندی، مہارت، محنت اور حُب الوطنی سے کام لیتے ہوئے مغرب کی اجارہ داری کو درجہ بدرجہ ختم کیا جائے، مغرب اپنے معاشی مفاد کا تحفظ بڑی بے باکی اور سفاکی کے ساتھ کرتا ہے۔ حکومتیں بدلنا تو آسان سی بات ہے۔ یہ لوگ سرحدیں بدلنے سے باز نہیں آئیں گے۔ نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دوشمنی اچھی۔'' [۹]

انُھوں نے یہاں واضح کر دیا کہ مغرب کی بالادستی کسی صورت برصغیر اور ایشیائی ممالک میں ترقی و خوشحالی نہیں دیکھ سکتی، یہی حال برصغیر پاک و ہند میں ہوا جہاں برصغیر و پاک و ہند کو سونے کی چڑیا قرار دیا جاتا

تھا، وسائل و خوشحالی کی بدولت یہاں پر انگریزوں نے سب کچھ قبضہ کرتے ہوئے اپنی جبری حکومت مسلط کی اور نو آبادیاتی نظام کو نافذ کر دیا۔ اسی طرح ایران کی سیاسی و سماجی صورتحال کا فکری سطح پر جائزہ لیا جائے تو ایران کی معاشی صورتحال انتہائی مستحکم تھی دُنیا کی نظریں ایران کے وسائل پر مرکوز تھیں وقت گُزرنے کے ساتھ ساتھ امریکی پالیسوں کی روشنی میں ایران کو مختلف تجارتی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

معاشی مفاد کے تحفظ کے لیے اقدامات نہ ہونے کے باعث انھوں نے ایران کے سیاسی نظام کو اپنی مرضی و منشاء میں لینا شروع کیا اور پورے ایران میں حکومتی مخالفت اور انقلاب کی آوازیں سنائی دینا شروع ہو گئیں۔ ان حالات کے پیشِ نظر جہاں برصغیر پاک و ہند کے اندر مختلف تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہاں پر ایران کے اندر بھی یہ تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں اور تاریخ بدلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اُنھوں نے اپنی مٹی کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنی تحریروں میں برصغیر کی عوام کی جدوجہد اور حالات و واقعات کو فکری سطح پر ''لوحِ ایام'' میں ایران کی بدلتی صورتحال کے حوالے سے بھی بیان کیا ہے۔ وہ آزادی کے بعد پاکستان اور قیامِ ایران کے دوران ایران کی صورتحال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دونوں ممالک کی سیاسی صورتحال کو تقابلی سطح پر پرکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''تاریخ بدل رہی ہے، جغرافیہ بدل رہا ہے۔ دُنیا بدل رہی ہے۔ یہ تبدیلی صرف ایران میں نہیں ہو رہی۔ ہر جگہ ہو رہی ہے۔ زمانہ پاکستان میں بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ کئی اور ملکوں میں بھی وقت تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ وقت کبھی ٹھہرتا نہین ہے۔ وقت ہمیشہ حرکت کرتا ہے۔ لیکن جب کسی ملک میں اس کی رفتار یکایک بے حد تیز ہو جائے اور سمت غیر معین ہو تو وہاں کی حکومت کے لیے نئے نئے مسائل اور طرح طرح کی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔''[۱۰]

مختار مسعود نے ''لوحِ ایام'' میں فکری حوالے سے دونوں معاشروں، ممالک اور حکومتوں کا تقابلی سطح پر جائزہ پیش کرتے ہوئے تاریخ کے تسلسل اور وقت کے بدلنے کا تذکرہ کرتے ہوئے وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات ان کے اسباب، اثرات اور ملکی و بین الاقوامی سطح پر ان کا احوال بیان کیا ہے۔ جہاں برصغیر کی اقوام

نے اپنے الگ تشخص اور آزادی کے لیے جدوجہد کی وہاں پر ایران کے لوگوں نے بھی رضا شاہ پہلوی کے اقتدار کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور جمہوری رویوں کے فروغ کے لیے اپنا کردار ادا کیا۔

مختار مسعود نے علی گڑھ کے منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے ایران کے بدلتے سیاسی و سماجی حالات کا جائزہ لیا اور دونوں ممالک کے تقابل کی صورت میں اسے پرکھا۔ برصغیر کے حالات میں جہاں عالمی طاقتوں کا کردار واضح دیکھا جا سکتا ہے وہاں پر ایران کے سیاسی بدلتے ہوئے حالات میں بھی عالمی طاقتوں کا کردار ہمہ وقت موجود رہا۔ اسی لیے مختار مسعود نے ان عالمی ممالک اور ان کی سازشوں کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دوشمنی اچھی کیونکہ یہ لوگ سرحدیں بدلتے دیر نہیں لگاتے جیسا برصغیر پاک و ہند کے اندر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

مختار مسعود نے تحریکِ پاکستان کی عظیم جدوجہد اور قربانیوں کے بعد ایک مرتبہ پھر ایران میں ایسے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے جہاں جدوجہد، عوامی اُمیدوں کے مینار ان کا اظہار اور سیاسی سطح پر تبدیلی اور انقلاب کا شور ہر جگہ سنائی اور دکھائی دے رہا تھا۔ اُنھوں نے تاریخ کو تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کے بعد ایک مرتبہ پھر سے اپنی آنکھوں کے سامنے بنتے ہوئے دیکھا جس کا اظہار فکری طور پر ان کی تیسری کتاب ''لوح ایام'' میں دکھائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر روف پاریکھ مختار مسعود کے قیامِ ایران اور انقلابِ اسلامی کے چشم دید گواہ کے حیثیت سے مختار مسعود کی کتاب ''لوح ایام'' پر ناقدانہ رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مختار مسعود کو ۱۹۷۸ء میں چار سال کے لیے آر سی ڈی، یعنی علاقائی تعاون برائے ترقی کی تنظیم کا جنرل سیکرٹری مقرر کیا گیا تھا اور ان کی تعیناتی تہران میں ہوئی تھی، اُس زمانے میں ایران میں شاہ کے خلاف تحریک زُوروں پر تھی۔ مختار مسعود ایران کے اس انقلابِ اسلامی کے چشم دید گواہ تھے۔ تاریخ کے اس دیوانے کو خوشی یہ تھی کہ تحریکِ پاکستان کے بعد ایک بار پھر تاریخ کو بنتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، بلکہ خود اس کا حصہ ہوں اور انقلاب کے معنی ایران میں پڑھ یا

سن نہیں رہا، بلکہ دکھ رہا ہوں۔ اُن کی تیسری کتاب ''لوحِ ایام'' انہی ایام کی روداد ہے۔ شاہ کو ایران سے بھاگنا پڑا اور نئی انقلابی حکومت نے ۱۹۷۹ء میں آر سی ڈی کو تحلیل کر دیا۔''(۱۱)

ڈاکٹر روف پاریکھ نے مختار مسعود کے قیامِ ایران کو ان کی خوش نصیبی قرار دیتے ہوئے لکھا کہ مختار مسعود نے اس سے قبل تحریکِ پاکستان اور پاکستان کی تاریخ بنتے ہوئے دیکھی اور اب وہ اپنی آنکھوں سے ایران میں تاریخ بنتے ہوئے انقلاب کی صورت میں دیکھ رہے ہیں وہ تاریخی اعتبار سے ایک مورخ کی صورت میں ان حالات وواقعات کے چشم دید گواہ ہیں جو اُنھوں نے اپنی تیسری کتاب ''لوحِ ایام'' میں قلمبند کیے ہیں۔

بلاشبہ ''لوحِ ایام'' میں انھوں نے قیامِ ایران اور تہران میں دورانِ فرائضِ منصبی ان حالات کو دیکھا۔ اپنے تاریخی شعور کی کسوٹی پر اسے اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ وہ انقلابِ اسلامی کے چشم دید گواہ اور اسے بیان کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ جو ایک علمی و تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتی ہیں۔

انقلابِ اسلامی پر مختار مسعود کی تحریریں فکری و تاریخی حوالے سے ایک اہم حوالہ مانی جاتی ہیں، کیونکہ وہ خود اس بدلتی تاریخ کا حصہ تھے جو اُنھوں نے ''لوحِ ایام'' کی صورت میں قلمبند کیے ہی۔ مختار مسعود کے قیامِ ایران اور بطورِ برصغیر پاک و ہند کے نمایندے کی حیثیت سے ایران میں ان کا قیام اور تاریخی حوالے سے بدلتے ہوئے آہنگ کو اُنھوں نے ایسے بیان کیا ہے اس بارے میں خرم سہیل اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں کہ:

''مختار مسعود کی تیسری کتاب ''لوحِ ایام'' ایک کتاب نہیں، تاریخ کی گواہی ہے، جس میں یہ چشم دید گواہ ہیں۔ یہ ملک ایران ہے، جہاں ڈھائی ہزار سالہ بادشاہت کا خاتمہ ہوتا ہے اور اسلامی انقلاب برپا ہوتا ہے۔ جس کو خونچکاں ''ایران بیتی'' کو انہوں نے ایک پڑوسی ملک کے باشندے کے طور پر، ایک حساس انسان ہونے کے ناطے اور تاریخ کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے بھرپور طریقے سے لکھا ہے، بلکہ اس کو گہرائی سے لکھنے کے لیے اپنی جان بھی خطرے میں ڈالی۔ یہ کتاب ایران کے انقلاب پر ہمیشہ ایک بنیادی حوالہ رہے گی، کیونکہ اس کے ماخذات کہیں اور سے نہیں، بلکہ چشم دید گواہ کے مشاہدے اور تجربات سے نکلے ہیں۔''(۱۲)

مختار مسعود نے ایران کے حالات وواقعات کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے تاریخی شعور کو بُروئے کار لائے ان حالات کا تقابل پاکستانی سیاست اور تاریخی پسِ منظر کے ساتھ کیا جہاں برصغیر کے رہنے والوں کی جدوجہد سے لے کر تحریکِ علی گڑھ، تحریکِ پاکستان اور پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد سے لے کر مختلف سیاسی خلفشار و انتشار کے باعث حالات کا بگڑ جانا، حالانکہ اس ملک کے حصول کے لیے سب نے مل کر جدوجہد کی لیکن اس کے قیام کے بعد اختیارات کی تقسیم، مال و دولت و سرمائے کی تقسیم اور حکومتوں میں رہتے ہوئے عہدوں کی تقسیم سے لے کر جمہوری رویوں کے فروغ میں جو رکاوٹیں درپیش آئیں وہ بعد ازاں مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی کی صورت میں سامنے آئیں۔

ملک کا دولخت ہو جانا عالمِ اسلام اور بالخصوص اسلامی جمہوریہ پاکستان کے لیے عظیم سانحہ تھا اس سانحہ کے پس پردہ محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف مختار مسعود نے اسے تقابل اور موازنہ کی صورت میں پاکستان اور ایران کی موجودہ انقلابی صورتحال کے ساتھ منسلک کرتے ہوئے اس کا تجزیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔

مختار مسعود تحریکِ پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے جب علی گڑھ سے لے کر ایران کی موجودہ انقلابی صورتحال تک کا جائزہ پیش کرتے ہیں تو اس دوران وہ دونوں معاشروں کی ناہمواریوں کو بیان کرتے ہیں اور بطورِ طنز اسے خوابِ غفلت اور حماقت قرار دیتے ہوئے نظام کے لیے کمزوری قرار دیتے ہیں۔ اس صورتحال میں ملک کے اندر جو چند لوگ اور طبقے سامنے آتے ہیں اخلاقی بُرائیوں کو دور کرنے اور قومی وحدت اور یک جہتی کو مضبوط کرنے انہیں مشکلات کا نہ صرف سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔

آزادیِ اظہارِ رائے پر قدغن مقتدر طبقوں کی جانب سے لگا دی جاتی ہے۔ وہ طبقات جو مصلحت کا راستہ اپنانا چاہتے ہیں اور ملک کو مشکلات اور دولخت ہونے سے بچانا چاہتے ہیں انہیں حبُ الوطنی کا نام دیتے ہوئے نشانہ بنایا جاتا ہے۔ عالمی سطح پر مسلمانوں اور بالخصوص اسلامی جمہوریہ پاکستان کے باشندوں کو ہتک آمیز رویے کا سامنا اسی وجہ سے کرنا پڑتا ہے کہ ہم خود آپس میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ کسی سیاسی و قومی معاملے اور مسئلہ پر ہمارا

اتفاق ناممکن دکھائی دیتا ہے۔یہی وجہ سے ذلت ورسوائی ہمارا مقدر بنتی ہے اور آزاد ملک ذہنی غلامی میں مبتلا رہتے ہوئے دولخت ہو جاتا ہے۔ان مشکلات و تکالیف کو مختار مسعود نے اس پیرائے میں بیان کیا ہے کہ:

"ہمارے یہاں ملک کا بھلا چاہنے والوں کو سزا ملتی ہے۔ مگر اسے تباہ کرنے والوں میں سے کبھی کسی کو سزا نہیں ملی۔ آپ ملک کی ترقی روک دیجیے۔ قرض کے بوجھ تلے اس کو دفن کر دیجیے۔ غیر ملکیوں کو اس پر مسلط کر دیجیے۔اس کے دو ٹکڑے کر دیجیے۔نوے ہزار کو جنگی قیدی بنا دیجیے۔ آپ کو کوئی سزا نہیں ملے گی۔زیادہ سے زیادہ ایک کمیشن بنے گا جو اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ کوئی ایک فرد یا ادارہ کسی قومی المیہ کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے۔جو کچھ ہوا وہ نظریہ ضُرورت کے تحت ناگزیر تھا۔ نظریہ ضُرورت کی سب سے بڑی خرابی یہ نہیں کہ اس کی مصلحتوں کے تحت ہر بار غیر قانونی عمل کو قانونی قرار دیا گیا۔بلکہ یہ ہے کہ اس نظریہ نے ہم کو بے حس اور بے تعلق بنا دیا ہے۔"(۱۳)

مختار مسعود نے یہاں ملکی و قومی سطح پر کی جانے والی غلطیوں اور کوتاہیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے ایک المیہ قرار دیا ہے کہ اتنے بڑے سانحات کے باوجود اسے نظریہ ضرورت قرار دیتے ہوئے پسِ پشت ڈال دینا انتہا درجے کی لاپروائی و غفلت ہے۔ جس کے نتیجہ میں آج تک ماضی سے کوئی سبق نہیں حاصل نہیں کیا گیا جس کی پاداش میں مستقبل میں ان تکالیف و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مختار مسعود نے یہاں تحریکِ پاکستان سے لے کر قیامِ پاکستان اور قیامِ پاکستان سے لے کر اس کے دولخت ہونے اور مسائل و انتشار کا شکار ہونے تک کا احوال ہماری غلطیوں، کوتاہیوں اور نادانیوں سمیت بیان کیا ہے۔ کہ ہر بار کی طرح اندرونی کمزوریوں کے باعث ہمیں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ماضی سے نابلد رہتے ہوئے مستقبل میں نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔

ان رویوں کی عکاسی مختار مسعود نے "لوحِ ایام" کے صفحات پر رقم کی ہے۔جو پاکستان اور ایران کے سیاسی و سماجی تقابل کے ساتھ ساتھ دونوں ممالک و اقوام کی روایتی غلطیوں کی عکاسی کرتی ہیں جس کی بدولت دونوں اقوام کو تاریخ میں ذلت و رسوائی کے ساتھ ساتھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

مختار مسعود نے پاکستان اور ایران کی سیاسی صورتحال میں مغربی اور عالمی سطح پر مداخلت اور ان کی سازشوں کے بارے میں آگاہی فراہم کرتے ہوئے تحریکِ علی گڑھ، تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک کے حالات کو بیان کیا ہے۔ کبھی مذہب کے نام پر خطے میں منافرت پھیلائی جاتی ہے کبھی زبان کے نام پر تو کبھی شخصیات و عہدوں کے نام پر سیاسی و سماجی انتشار کی فضا قائم کی جاتی ہے۔

ان تمام عوامل کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو مغربی مداخلت ہر جگہ دکھائی دیتی ہے جس کی بنا پر اندرونی و بیرونی دونوں محاذ پر فتنہ و فساد نہ صرف برپا ہوتا ہے بلکہ مقامی سطح پر قومی وحدت و یک جہتی کو نقصان پہنچتا ہے۔ مختار مسعود نے ''لوحِ ایام'' میں مغربی ذرائع ابلاغ کا کردار بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے کہ مغربی ذرائع ابلاغ کسی کی کردار کشی اور کسی کو زیرو سے ہیرو بنانے میں ماہر ہے اور اس کے اس عمل سے مشرقی اقوام بہت جلد متاثر ہوتے ہوئے اس کے زیرِ عتاب آجاتی ہیں۔ مختار مسعود لکھتے ہیں کہ:

''مغرب عالمی ذرائع ابلاغ پر اتنی کامل دسترس رکھتا ہے کہ وہ جب چاہے تیسری دُنیا کے کسی بھی لیڈر کو سارے جہان میں بدنام کرنے کی مہم چلا کر پنجرہ میں بند پرندہ کی طرح بے بس کر دے۔ اس قول کا دوسرا رُخ بھی اسی قدر درست ہے۔ مغرب جب چاہے تیسری دُنیا کے کسی بھی لیڈر کو خواہ وہ کتنا نکما ہی کیوں نہ ہو اتنا عظیم و بے مثال اور ایسا نابغہ عصر بنا کر پیش کر سکتا ہے کہ لوگ اس بات پر فخر کرنے لگیں کہ وہ اس کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔ مغرب کو شخصیت سازی کے علم میں کتنا کمال حاصل ہے۔ جتنا کردار کشی کے فن میں۔ شہنشاہ ایران کی زندگی کے آخری چند سالوں میں مغرب نے اس علم و فن کا بھرپور مظاہرہ کیا۔''(۱۴)

مختار مسعود نے عالمی تناظر کو دیکھتے ہوئے ایشیائی اقوام اور عالمی ذرائع ابلاغ کا منفی کردار بیان کیا ہے۔ جو اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے مشرقی اقوام کے حالات پر کنٹرول حاصل کرتے ہوئے شخصیات کی کردار کشی میں ماہر ہوتے ہیں اور اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے نکمے اور نااہل لوگوں کو دُنیا میں بڑا لیڈر متعارف کروانے میں کمال فن رکھتے ہیں ان تمام عالمی سازشوں کے تناظر میں شاہِ ایران کے آخری ایام بھی گُزرے

ہیں اور بالآخر وہ جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوا۔ مختار مسعود نے ان تناظر کو تحریکِ علی گڑھ، تحریکِ پاکستان اور موجودہ سیاسی و سماجی صورتحال کے تناظر میں تقابل کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔

ج: انقلابِ اسلامی (انقلابِ ایران) کا پاکستانی تہذیب و ثقافت اور اردو ادب پر اثرات

انقلابِ اسلامی یعنی انقلابِ ایران کے جہاں دیگر خطوں پر اثرات مرتب ہوئے وہاں پر بطورِ اسلامی ہمسایہ ملک پاکسان میں بھی اس بڑی انقلابی تبدیلی کے اثرات مرتب ہوئے۔ مختلف تحریکوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان تحریکوں کے فروغ میں وعلم و ادب کے اثرات نمایاں ہیں۔ تحریکِ پاکستان میں اُردو زبان و ادب کا کردار روشن و اہم ہے جہاں علم و ادب میں ایسے موضوعات کو فروغ حاصل ہوا جن کی بدولت اخلاقی اقدار، قومی وحدت و یک جہتی، قومی و ملی شاعری کا فروغ اور ایسے فن پارے تخلیق کیے گئے جو تحریکِ پاکستان کی جستجو اور راستے کو تقویت دینے کا باعث بنتے ہیں۔

تحریکِ علی گڑھ، برصغیر پاک وہند کی وہ نمایندہ تحریک ہے جس نے قیامِ پاکستان کے لیے کئی ادباء کے ساتھ مل کر عظیم جدوجہد کا آغاز کیا اور الگ قومی وحدت و تشخص کی بنیاد رکھی۔ اس صورتحال کے پیشِ نظر "لوحِ ایام" میں مختار مسعود نے ایران میں رونما ہونے والے انقلابِ اسلامی کے پاکستانی معاشرے پر اثرات اور اُردو زبان و ادب پر اس کے اثرات کا جائزہ پیش کیا ہے۔

اُردو اور فارسی زبان و ادب میں بہت گہرا تعلق اس کے علاقائی، مذہبی اور لسانی روابط کی وجہ سے بھی ہیں۔ اُردو اور فارسی کا تعلق ان زبانوں کے علمی و ادبی سرمایے کی بدولت ان کے موضوعات اور مباحث کا مشترک پن ایک مکمل روایت کو جنم دیتا ہے۔

تحریکِ پاکستان کے اندر بھی ایسے کئی شعراء و نثر نگار سامنے آتے ہیں جن کی انقلابی شاعری و فن پاروں کی بدولت تحریکِ پاکستان کو پُرجوش ولولہ، ذہنی و فکری ہم آہنگی اور الگ نصب العین کے ساتھ ساتھ مزید

جد وجہد و لگن کا جذبہ اُجاگر ہوا جس کی بدولت ایک قومی یک جہتی کی فضا قائم ہوئی ہے۔اس فضا کی بدولت تحریکِ پاکستان میں لوگوں، عوام کی شمولیت جوق در جوق ہونے کے ساتھ ساتھ لوگوں نے عملی سطح پر قیامِ پاکستان اور انگریزوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے اپنا اپنا کردار ادا کرنے کے ساتھ اپنے حصے کی شمع جلائی۔

مختار مسعود نے اس صورتحال کو ان حالات میں پرکھتے ہوئے انقلابِ ایران(انقلابِ اسلامی) میں ان فارسی شعراء اور ادباء کو بھی تحقیق اور اپنے علمی و ادبی تاریخی شعور کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے سامنے لایا ہے جن کے موضوعات اور فن پارے انقلابِ اسلامی اور بادشاہت کے خلاف موثر آواز بن کر سامنے آئے۔انقلابِ اسلامی کے پاکستانی تہذیب و ثقافت پر اثرات سے قبل تہذیب کی تعریف سبطِ حسن نے جن الفاظ میں کی ہے جس کے بعد ان اثرات کا جائزہ معنی خیز اور سہل ہو جاتا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

"کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر و اساس کو جوہر ہوتی ہے۔چنانچہ زبان، آلات و اوزار پیدوار کے طریقے اور سماجی رشتے، رہن سہن، فنونِ لطیفہ، علم و ادب، فلسفہ و حکمت، عقائد و افسوں، اخلاق و عادات، رسوم و روایات، عشق و محبت کے سلوک اور خانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔"(۱۵)

ڈاکٹر سبطِ حسن نے معاشرے میں موجود مختلف عوامل کو تہذیب کے حصہ قرار دیا ہے۔ان میں فنونِ لطیفہ اور علم و ادب بھی شامل ہیں۔ایران کی بدلتی سیاسی صورتحال کے اثرات پاکستانی تہذیب و ثقافت پر منتقل ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو ادب پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

دُنیا میں موجود ہر قوم اپنے تہذیبی و ثقافتی ورثے سے منسلک رہتی ہے یہ اس قوم و ملک کی الگ پہچان اور دُنیا میں الگ تشخص کا باعث بنتا ہے۔لیکن مختلف اقوام کے درمیان یہ تہذیبی ورثے اور تہذیبی عوامل آپس میں مشترک اور ملتے جلتے بھی ہیں۔بہر حال ہر قوم کی کچھ منفرد خصوصیات تہذیبی و ثقافتی حوالے سے ضرور موجود رہوتی ہیں جو انہیں دُنیا میں دیگر اقوام سے الگ اور ممتاز کرتی ہیں۔

انقلابِ اسلامی بیسویں صدی میں اُبھر کر سامنے آیا لیکن ایرانی تہذیب کے اثرات زمانہ قدیم سے برصغیر پاک وہند میں اپنی جڑیں مضبوط کر چکے تھے اس کا سب سے بڑا اظہار اور اثر فارسی زبان کے ذریعے اس خطے میں براہ راست منتقل ہوتی رہی۔ فارسی زبان کو عزت و تکریم کی نشانی سمجھا جاتا رہا اور جس شخص کو فارسی زبان نہیں آتی اس کو اُجڈ اور گنوار تصور کیا جاتا۔ فارسی زبان کے اثر و نفوذ کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں جب جگہ جگہ غیر مسلموں کی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں پھر بھی ان کی دفتری زبان فارسی ہی تھی۔ ایرانی تہذیب کے ان بڑھتے اثرات کو قلمبند کرتے ہوئے مزید ڈاکٹر سبطِ حسن بیان کرتے ہیں کہ:

''ایرانی تہذیب کے غلبے کے سبب سے زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ترکوں کا رہن سندھ وادی کے باشندوں سے مختلف تھا۔ ان کی ضرورت کی چیزیں بھی یہاں سے مختلف تھی۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے سلسلے میں متعدد صنعتوں نے رواج پایا اسی نسبت سے نئے نئے ہنر اور پیشے اختیار کیے جانے لگے اور حکامِ وقت کے طور طریقے اور رسوم و رواج بھی اپنائے جانے لگے، اور بہت دن نہ گُزرے تھے کہ برصغیر کی خوراک ار پوشاک پر، سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز پر، علم و حکمت پر، ادب، مصوری، موسیقی، رقص و تعمیر، آرائش و زیبائش کے سامان، حرف و ضرب کے آلات، اور نشت و برخواست کے آداب سب پر ایرانی تہذیب کا رنگ چڑھ گیا۔''(۱۶)

ان تہذیبی عوامل اور اثرات کو مختار مسعود نے پاکستانی معاشرے، تہذیب و ثقافت کے حوالے سے بیان کرتے ہوے ان کے اثرات کا جائزہ علمی و ادبی حوالے سے بھی لیا ہے۔ علم و ادب میں مشترکہ طور پر کئی ایسے موضوعات اور مزاحمتی رویے ایسے موجود تھے جن کی بدولت انقلابی تحریکوں کو تقویت ملی اور ایک منظم رویے نے عروج حاصل کرتے ہوئے تحریک کا رنگ دھارا اور ملکی و بین الاقوامی سطح پر بڑی انقلابی تبدیلیوں سے معاشرے کو آشکار کیا۔

انقلابِ اسلامی کے یہ اثرات جہاں ایران کے گرد و بیش پر منتقل ہوئے وہاں اس سے متصل دیگر علاقوں اور ممالک میں بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ان حالات کے پیشِ نظر انقلابِ اسلامی تاریخی حوالے سے بہت اہم ثابت ہوا۔شہید صفی پوری نے اپنے مقالات میں انقلابِ اسلامی اور تہذیبی و ثقافتی سطح پر اس کے عالمی اثرات اور رُجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے اسے مفصل انداز میں پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''ایران کا انقلاب بھی ایک عظیم تاریخی واجتماعی حقیقت کے عنوان سے وجود میں آیا جس نے موجودہ صدی میں دُنیا کے سیاسی نظام، معاشرتی نظام، تہذیبی توازن، علمی و ادبی معیارات کو توڑنے کے لیے ایک نئی راہ کا انتخاب کیا۔اور ایک اہم تاریخی واجتماعی حقیقت بن کر سامنے آیا۔اپنے انقلابی طرز و شیوہ عمل کے لحاظ سے نیز اس سے مربوط مختلف میدانوں میں خُدا پر ایمان رکھنے والے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں اور عدالت کے خواہاں عوام کی موجودگی کے اعتبار سے شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ انقلاب تاریخِ انسانیت کا بے نظیر انقلاب ہے۔''[۱۷]

ایران کا انقلاب تاریخی حوالے سے نئے رُجحانات اور ایک اجتماعی حقیقت کے طور پر اُبھرا جس کے اثرات پر مکتبہ فکر پر منتقل ہوئے۔لوگوں کے رہن سہن، طرزِ عمل، اجتماعی شعور اس بات کے غمازی تھے کہ وہ ایران کے اس موجودہ نظامِ بادشاہت سے تنگ اور انکاری ہیں۔ جس کی پاداش میں وہ بڑی انقلابی تبدیلی کے سرکردہ و خواہش مند تھے، تاکہ وہ دُنیا میں اپنی اسلامی روایات، تہذیبی ورثے، علمی و ادبی ورثے اور الگ قومی و ملی تشخص کو بحال کرتے ہوئے جمہوری رویوں کو فروغ دے سکیں۔آخر کار وہ دن آن پہنچا جب ایران کی تاریخ بدلی اور رضا شاہ پہلوی کو ملک بدر ہونا پڑا اور ایران میں اسلامی انقلاب کا علم بلند ہوتے ہوئے اسلامی انقلاب کا سورج طلوع ہوا۔

مختار مسعود نے انقلابِ اسلامی اور ایران کے بدلتے حالات کے تناظر میں علمی و ادبی اثرات کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ان کی تحریروں میں اُردو اور فارسی زبان و ادب کے تقابل کے ساتھ ساتھ پاکستانی اور ایرانی ادیبوں اور لکھاریوں کا تقابلی جائزہ بھی ملتا ہے۔ تحریکِ پاکستان میں کئی ادباء نے شمولیت اختیار کرتے ہوئے قومی یک جہتی اور نظریہ پاکستان کے فروغ کے لیے اپنا اپنا کردار ادا کیا۔اسی طرح انقلابی موضوعات کی نمایندگی، ایرانی

شعراء و ادباء میں دکھائی دیتے ہیں۔ جن سے عوامی سطح پر انقلابِ اسلامی، جمہوری اقدار کا فروغ، عوامی کے جذبات واحساسات کی حقیقی ترجمانی دکھائی دیتی ہے۔

مختار مسعود نے جہاں اُردو زبان و ادب کے کردار پر بات کرتے ہوئے سر سید، اقبال، حالی و دیگر ادباء و شعراء کا ذکر کرتے ہوئے ان کی خدمات تحریکِ پاکستان کے لیے گنوائی اور پیش کی ہیں، وہاں پر مختار مسعود نے ایرانی ادباء و شعراء کا ذکر بھی کیاہے جن کے موضوعات انقلابِ اسلامی کی تحریک کو جلا بخشنے کا باعث بنے۔

ایرانی مصنفین و شعراء میں جلال آل احمد، صادق ہدایت، مرتضیٰ مطہری اور ڈاکٹر علی قریشی نے انقلابِ اسلامی کا پرچار کیا اور عوام کی اصلاح کرتے ہوئے انہیں مستقبل کی خوش خبری اور امید فراہم کرتے رہے۔ مختار مسعود نے اپنے تاریخی، علمی و ادبی شعور کی بدولت ایرانی شعراء پر ناقدانہ رائے اور تجزیاتی جائزہ بھی پیش کیاہے۔ مختار مسعود نے ایرانیوں کے علمی و ادب کے بارے میں لکھا کہ:

''ایرانیوں کو سمجھنے کے لیے ان کی شاعری کو سمجھنا ضُروری ہے۔ قصیدہ نے ان کے مزاج میں مبالغہ بھر دیا ہے۔ تعریف و توصیف ایک میکانکی اور مشینی عمل بن گیاہے۔ وہ ممدوح میں ایسی ایسی خوبیاں ڈھونڈ لیں گے جو اس کی پشتوں میں بھی کہیں نہیں ملی، مُراد صرف یہ ہے کہ اظہار اور بیان پر ہماری قدرت دیکھو اور سر دھنو، غزل نے انہیں رومان پسندی اور حقیقت سے فرار کا سبق دیا ہے۔ مرثیہ نے ان کے پاوں میں زنجیر ڈال دی ہے۔ زمین بنجر ہے۔ ذہن زرخیز ہے۔ تضاد ان کے یہاں کئی ملیں گے۔ سب سے بڑا یہ کہ حضرت امام حسینؑ کا دم بھرتے ہیں مگر صدیوں سے مطلق العنان بادشاہوں کی رعایاہیں۔''(۱۸)

مختار مسعود نے ایرانیوں کے علم و ادب پر ناقدانہ رائے کا اظہار کرتے ہوئے ان کی شعری اصناف پر تجزیاتی جائزہ پیش کیا۔ اُنھوں نے لکھا کہ ایران کے سیاسی و سماجی ماحول کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کو سمجھنا انتہائی ضروری اور مفید ثابت ہوتا ہے۔ شاعری میں ایرانیوں کے ہاں مختلف شعری اصناف میں طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ قیصدہ تعریف و توصیف تک محدود نہ رہا بلکہ ممدوح کے لیے زمین و آسامن کی خصوصیات یکجا کرتے ہوئے اس کا منبع مدوح کو قرار دیا جاتا یعنی انتہا درجے کا مبالغہ ان کے علم وادب میں بالخصوص قیصدوں میں

دکھائی دیتا ہے۔ غزل کے حوالے سے مختار مسعود نے لکھا کہ وہ انہیں حقیقت پسندی سے دور دُنیائے رومان میں منتقل کر دیتی ہے۔

مرثیہ نویسی میں ایرانی و فارسی زبان بولنے والے کمال رکھتے ہیں۔ یہ ان کی عقیدت کا تقاضا بھی ہے کیونکہ مسلکی اعتبار سے مرثیہ ان کے مذہب و مسلک سے میلان رکھتا ہے۔ ہر خوشی غمی میں وہ مرثیہ خوانی کرتے ہیں اور سینہ کوبی کرتے ہیں۔ مختار مسعود ان کے علم و ادب پر بات کرتے ہوئے ان کے اذہان کو زرخیز جبکہ زمین کو بنجر قرار دیتے ہیں۔ مذہبی و سیاسی ماحول کو جوڑتے ہوئے مختار مسعود نے لکھا ہے کہ یہ لوگ انتہائی درجہ کے عقیدت مند اور مذہبی طور پر اپنے مسلک سے ہر سطح پر منسلک رہتے ہیں۔

امامِ حسین علیہ السلام کی تعلیمات اور عقیدت ان کے قلوب و اذہان کو منور کرتی ہے لیکن ان کی بد قسمتی اور ستم ظریفی دیکھیے کہ برسوں سے ظالم و جابر اور مطلق العنان بادشاہوں کے زیرِ سایہ زندگی گُزار رہے ہیں۔ مختار مسعود نے ''لوحِ ایام'' میں اُردو اور فارسی زبان کے تعلق ان کے اشتراکات اور افتراکات کا باہمی جائزہ لیتے ہوئے دونوں زبانوں کے لسانی رشتے پر بھی لکھا اور کہا ہے کہ:

''آوارہ مویشی جسے اُردو بولنے والے کانجی ہاوس میں داخل کرا دیتے ہیں ایران میں جانور بے صاحب کہلاتا ہے۔ جو پاکستان میں بے آواز ہے وہ ایران میں بے صدا ہے۔ اُردو میں جو شیش محل ہے وہ فارسی میں آئینہ خانہ یا جام خانہ ہے۔ جام طرح طرح کے ہوتے ہیں اور دونوں ملکوں میں پائے جاتے ہیں مگر جامِ فرعونی صرف ایران میں ہوتا ہے۔ مکان یا دکان لیتے وقت جو رقم کرائے سے زائد دینی پڑتی ہے اسے ہم لوگ نہ جانے کس رعایت سے پگڑی کہتے ہیں۔ ایران میں رق کو زرِ کلید کے طور پر دی جاتی ہے۔ کلیدی اختیارات ہمیشہ زر کے عوض ملا کرتے ہیں خواہ وہ مکان ہو یا دکانِ سیاست۔''(۱۹)

مختار مسعود نے دونوں زبانوں کے الفاظ اور ان کے تعلق کو پاکستان اور ایران کے علم و ادب کے سائے میں پرکھتے ہوئے کئی الفاظ کا ذکر کیا اور ان کے معنی و مفاہیم کو دونوں زبانوں کے لسانی رشتے و تعلق کو ملحوظِ خاطر

رکھتے ہوئے بیان کیا۔ ایک لفظ فارسی زبان میں دوسرے معنی پروئے ہوئے ہے جبکہ اسی کام یا چیز کے لیے اُردو میں کوئی اور لفظ مستعمل ہے۔

مختار مسعود جتنا عرصہ ایران میں قیام پذیر رہے دونوں معاشروں کے تعلق کو پرکھنے کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی حوالے سے بھی اُنھوں نے دونوں زبان و ادب کا بغور مطالعہ کیا اور ان کے باہمی تعلق کو ''لوحِ ایام'' میں بیان کیا۔ اُردو اور فارسی زبان کا بہت گہرا لسانی اور علمی و ادبی تعلق برسوں سے قائم ہے۔ اُردو زبان میں کئی الفاظ فارسی سے مستعار ہیں۔ شعر و شاعری میں دونوں زبانوں کے الفاظ بکثرت دکھائی دیتے ہیں۔ انقلابِ اسلامی کے زیرِ سایہ اور زیرِ اثر جس طرح ایران میں بڑی سیاسی و سماجی تبدیلیاں رونما ہوئی اسی طرح دونوں زبانوں میں بھی وقت کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہی۔

مختار مسعود نے ''لوحِ ایام'' میں اُردو اور فارسی زبان سے تعلقات اور لسانی رشتے کو انقلابِ اسلامی کے زیرِ سایہ اور انقلاب کے اثرا کے زیرِ مطالعہ تجزیاتی اور ناقدانہ طور پر بیان کیا ہے۔ ان تمام سیاسی، سماجی اور علمی و ادبی تبدیلیوں اور اثرات کا پیش خیمہ انقلابِ ایران ثابت ہوا انقلابِ ایران کی بہت سی وجوہات پر ناقدانہ رائے دیتے ہوئے سبطِ حسن رقمطراز ہیں کہ:

''ایران بڑا دولت مند ملک ہے۔ اس کے وسائل اتنے وافر ہیں کہ لوگوں کو اگر اپنے اقتصادی حالات سدھارنے کا موقع ملا ہوتا تو ایران میں آج نہ کوئی بھوکا ہوتا نہ بے روزگار لیکن جہاں استحصال اور زر پرستی زندگی کا نصب العین بن جائے وہاں امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتے جاتے ہیں اور کرپشن، لوٹ، رشوت اور مہنگائی کی بدولت زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ یہی اقتصادی زبوں حالی ایرانی انقلاب کا سبب بنی۔ اب کوئی لاکھ کہے کہ، ایرانیوں نے اسلام کے لیے خون کی قربانی دی تھی، سستے تربوزوں اور مکانوں کے لیے نہیں۔''[۲۰]

مختار مسعود نے ''لوحِ ایام'' میں اپنے مشاہدات و تجربات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ایران کے سیاسی و سماجی حالات و واقعات کا تذکرہ اور انقلابِ اسلامی کے رونما ہونے اس کے اثرات، علم و ادب کے اعتبار سے برصغیر اور ایران کی صورتحال کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔

مختار مسعود نے اپنی تحریروں کے عوض ''لوحِ ایام''میں تقابل کی فضاء پیدا کرتے ہوئے تحریکِ علی گڑھ، تحریکِ پاکستان اس کی لازوال جدوجہد اور ایران و پاکستان کے حالات کا سیاسی سطح پر جائزہ لیا ہے۔''لوحِ ایام'' میں ان تمام عناصر کے ساتھ ساتھ مختار مسعود نے علمی و ادبی اعتبار سے اُردو اور فارسی زبان و ادب کے رشتے، دونوں زبانوں کے اشتراکات، اثرات اور موجودہ صورتحال بھی پیش کی ہے۔

چار سالہ قیامِ ایران مختار مسعود کی نئی کتاب کی تخلیق کا باعث بنا جو ''لوحِ ایام'' کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے یہ سفر آسان نہ تھا انقلاب کا سفر اور راہ ہمیشہ پُر فتن، مشکل اور تکالیف سے بھرپور ہوتی ہے۔ پاکستان واپسی پر ان مناظر اور چشم دید حالات و واقعات کو تحریر کا لبادہ پہناتے ہوئے مختار مسعود نے ان لمحات کو تاریخی دستاویز کی حیثیت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

۲۔ حرفِ شوق

مختار مسعود کی چوتھی کتاب ''حرفِ شوق'' کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب ان کی وفات کے بعد منظرِ عام پر آئی۔ ''حرفِ شوق'' کا سنِ اشاعت جنوری ۲۰۱۷ء ہے۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مختار مسعود نے ''حرفِ شوق کا انتساب طلبہ علی گڑھ کے نام لکھا ہے۔ جبکہ ''حرفِ شوق'' کے دیباچہ میں چند گُزارشات اور حقائق سے پردہ اُٹھاتے ہوئے کئی راز افشاء کیے ہیں۔

مختار مسعود نے دیباچہ میں ''حرف شوق'' کی صنف کے بارے میں واضح لکھتے ہوئے کہا ہے کہ میں ایک طویل مضمون لکھ رہا ہوں لیکن یہ مضمون جس شخص کے بارے میں لکھا وہ کہی دکھائی نہیں دیتا۔ مختار مسعود نے ''حرفِ شوق'' میں چار اہم مضامین قلمبند کیے ہیں۔جو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت کتاب کا حصہ ہیں۔ ''ماضی کے ساتھ ایک نشت''، ''سر سید احمد خاں کون تھے؟''، '' باعثِ تحریر''اور'' مرحوم کے نام ایک خط''۔ ان چاروں مضامین میں جو'' حرفِ شوق ''کا حصہ ہیں، مختار مسعود نے علی گڑھ میں بسر کیے لمحات

حالات و واقعات اور مقامی سطح پر مختلف شخصیات ان سے ملاقاتیں، ان سے فیض یاب ہونا اور علمی و ادبی سطح پر ان سے استفادہ ہونا اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔

مختار مسعود کی کتاب ''حرفِ شوق'' کے دیباچہ میں اُنھوں نے چند شخصیات اور اپنے والد صاحب کی خواہش کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ایک دن والدِ محترم نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے غلام رسول مہر سے فرمائش کی کہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیں اور دُعا کریں کہ اسے بھی تصنیف و تحقیق کا شوق اور ہنر عطا ہو۔ اس واقعے کے کوئی دس برس بعد ''آوازِ دوست'' شائع ہوئی۔ اتنا عرصہ کون کسی کی تحریر کا انتظار کرتا ہے۔ دونوں بزرگ اس وقت تک اس دُنیا سے رُخصت ہو چکے ہیں۔ وقار عظیم اور ملا واحدی نے ''سفر نصیب'' کا انتظار نہیں کیا۔ محمد طفیل (نقوش) ابو الفضل صدیقی، جمیلہ ہاشمی اور ابنِ حسن برنی نے ''لوحِ ایام'' کا انتظام نہیں کیا۔ محترم رشید احمد صدیقی نے ''آوازِ دوست'' پڑھ کر مجھے دُعا دی۔ اس کے بعد میری تحریر ان کی مزید دُعاوں سے محروم ہو گئی۔ ان حالات میں اگر توفیق احمد خان نے ''حرفِ شوق'' کا انتظار نہ کیا تو کیا ہوا۔''[۲۱]

مختار مسعود نے ''حرفِ شوق'' کے دیباچہ میں چند علمی و ادبی شخصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ علمی و ادبی شخصیات کا فیض ہے کہ ان کی دُعاوں کے زیرِ سایہ میری تحریر میں قوت اور اسلوب میں روانی پیدا ہوئی لیکن انسان خواہشات کی طلبی میں خود غرض اور لالچی ثابت ہوا ہے۔ ہزاروں خواہشیں اس کے دل و دماغ میں جنم لیتی ہیں ایسا ماحول مختار مسعود کی علمی و ادبی کاوشوں کے دوران بھی حائل رہا لیکن وہ شخصیات جن تک وہ اپنی تحریریں پہنچانا چاہتے تھے وہ کتاب کی اشاعت سے قبل ہی دارِ مفارقت دے گئے۔ طالبِ علمی اور زندگی کے نشیب و فراز کو رقم کرتے ہوئے ان حالات کا تذکرہ اسلوب کی دل کشی اور منظر نگاری کرتے ہوئے ان حسین لمحات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یادگار بنایا۔

الف: رُوحِ عصر اور حرفِ شوق میں مقامی حالات کا تجزیاتی مطالعہ

مختار مسعود نے ''حرفِ شوق'' میں مقامی حالات و واقعات کا تجزیاتی جائزہ پیش کرتے ہوئے اپنے زمانہ طالبِ علمی سے لے کر تحریکِ علی گڑھ، نو آبادیاتی نظام، اس کے اثرات اور ان عوامل کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس دور کی رُوحِ عصر کو پیش کیا ہے۔ رُوح عصر کے بارے میں بہت سے ناقدین کی رائے ہیں کہ یہ معاشرے کا قوی رُجحان ہوتا ہے۔ جس کے پیشِ نظر علمی و ادبی مباحث جنم لیتے ہیں۔ ہر طرح کے تصورات ایک خاص رُجحان کے تحت پروان چڑھتے ہیں جو معاشرے و سماج کے سیاسی نظریات، سماجی روابط، اخلاقی عقائد اور علمی و ادبی تخلیقات میں ایک موثر کردار ادا کرتے ہیں۔ رُوح عصر کے بارے میں ڈاکٹر علی عباس جلال پوری نے لکھا ہے کہ:

''جب ہم کسی تاریخی دور کے سیاسی، عمرانی، اقتصادی، علمی اور فنی عوامل و موثرات کا ذکر ایک واضح اور جلی رُجحان کی روشنی میں کریں گے تو ہم کہیں گے کہ یہ رُجحان یا رُخ اس تاریخی دور کی رُوح ہے۔ روح عصر کی کسی مخصوص ترجمانی پر، سب مفکرین کا متفق ہونا ضُروری نہیں ہے۔''(۲۲)

رُوحِ عصر میں زمانے کا غالب رُجحان پایا جاتا ہے۔ ہر ادیب اپنے عہد کو لکھتا ہے لیکن وہ خارجی مظاہر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں لکھ سکتا اس کی تحریروں میں زمانے کے رُجحانات کی عکاسی ملتی ہے۔ کسی عہد کی رُوحِ عصر کے مطالعے سے غالب رُجحان رویوں و نظریات کی عکاسی ممکن ہے۔ اس کی بدولت ایک عہد، زمانے کو دوسرے عہد، زمانے سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ مختار مسعود نے ''حرفِ شوق'' میں جہاں مقامی حالات و واقعات کا تجزیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔ وہاں پر ہی اُنھوں نے اُس دور، عہد کے غالب رُجحانات، تحریکات اور فکری مباحث کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس زمانے کی رُوحِ عصر کو بیان کیا ہے۔

علی گڑھ میں زمانہ طالب علمی گُزارنے کے دوران مختار مسعود نے کئی نشیب و فراز دیکھے، مشکل حالات کا سامنا کیا، سیاسی اعتبار سے انہدام کی صورتحال، مقامی سطح پر افراتفری، فساد، لڑائی جھگڑے، سیاسی الزام تراشیوں

اور سب سے بڑھ کر بر صغیر پاک و ہند میں انگریزوں کے تسلط پر مسلمانوں کے دل پارہ پارہ ہو چکے تھے جو بر صغیر میں انگریزوں کی غلامی میں مبتلاء، محکومی کی زندگی گُزارنے پر مجبور تھے۔ ان مقامی حالات اور غالب رُجحانات کی روشنی میں مختار مسعود نے ان حالات کو بخوبی جائزہ "حرفِ شوق" میں بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

"ہمارا بچپن عالمی کساد بازاری کی نذر ہو گیا۔ لڑکپن سایہ تیغ میں گُزرا۔ دوسری جنگِ عظیم کے ختم ہونے تک ہم لوگ نوجوانی کی سرحد پار کر چکے تھے۔ سرحد کے دوسری طرف خانہ جنگی نے ہمارا استقبال کیا۔ آزادی کی جدوجہد آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ مسلمان بہ یک وقت دو جنگوں میں اُلجھ گئے۔ ایک انگریزوں کے خلاف اور دوسری اس جمہوریت کے خلاف جو بر عظیم کے مسلمانوں کو ایک کم حیثیت اور بے اعتبار اقلیت کے علاوہ کوئی اور درجہ دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ دونوں محاذِ جنگ جاں بازی اور فداکاری کا مطالبہ کرتے تھے۔ مسلمانوں نے بڑی قربانی دی۔ کچھ خوشی سے، کچھ لاچاری کے سبب بین الاقوامی سیاست میں کمزور کو انصاف کب ملا ہے جو ہمیں ملتا۔ ہماری آنکھیں اب کُھل چکی تھیں۔ ان چند برسوں میں ہم بہت کچھ دیکھ چکے تھے۔ عملی زندگی میں داخل ہونے کا وقت آ پہنچا تھا۔"(۲۳)

مختار مسعود نے بچپن سے لے کر نوجوانی تک کے حالات بر صغیر پاک و ہند کی مقامی صورتحال کے تناظر اور رُوحِ عصر کے ذریعے بیان کیے ہیں۔ جہاں پُر فتن دور میں آنکھ کھولی، سیاسی و سماجی عدم استحکام کا دور دورہ دیکھا۔ بر صغیر پر غیر ملکی اقوام کا قابض ہونا ان کے وسائل لوٹنا، اپنا نظامِ حکمرانی طول دیتے ہوئے، اپنے اُصول وضوابط نافذ العمل کرنا، آزادی کی جدوجہد کرنے والوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ گرانا، ان کی جدوجہد کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے مقامی عوام کو محکومی کی زندگی میں دھکیل دینا، وسائل و دولت کی غیر مساوانہ تقسیم، جمہوری و آمرانہ رویوں کی جنگ، عدم استحکام کی فضا قائم ہونا، سیاسی نظاموں کا انہدام رُوحِ عصر کے اہم رُجحانات اور رویوں کا شمار شامل ہے۔

مختار مسعود نے مقامی حالات وواقعات کے تناظر میں بیان کرتے ہوئے قیامِ علی گڑھ اور علی گڑھ کے طلبہ کی خدمات، تعلیمی معاملات کے دوران، جن سیاسی و سماجی شخصیات کو دیکھا، ملاقات کی اور سیاسی حوالے سے علی گڑھ کی خدمات کا سیر حاصل تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان نوجوانوں نے ہر سطح پر الگ وطن کی جستجو، الگ سیاسی و ملکی

تشخص اور قومی و ملی وحدت کے فروغ کے لیے سیاسی حکمرانوں کا طرزِ عمل، عوام کے ساتھ ان کا سلوک اور علمی وادبی رُجحانات کا منظر نامہ پیش کیا ہے۔

ان حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے مختار مسعود نے ''حرفِ شوق'' میں اپنے ذاتی حالات کا منظر بھی پیش کی ہے جب انُھوں نے علی گڑھ میں اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کیا اور علی گڑھ کی یادوں میں وابستہ لمحات کو اپنی کتاب میں قلمبند کرتے ہوئے ان لمحات کو یاد کرتے ہوئے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مختار مسعود نے ''حرفِ شوق'' میں علی گڑھ تحریک و کالج کے لیے سرسید کی خدمات کا بھی تذکرہ کیا ہے جنہوں نے ہزاروں ایکڑ ویران زمین و رقبہ کو آباد کرنے کے لیے کالج کا سنگِ بنیاد رکھا اور انتظامیہ سے اس بارے میں اجازت نامہ طلب کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی خدمات صرف کی اور ۱۸۷۷ء کو کالج کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، سرسید کی خدمات اور علی گڑھ کالج کے قیام کی مقامی داستان سُناتے ہوئے مختار مسعود لکھتے ہیں کہ:

''سرسید کا علی گڑھ کے لیے چندہ جمع کرنا ایک علیٰحدہ اور دلچسپ مضمون ہے۔ اشارہ فہم کے لیے اتنا کہنا کافی ہو گا کہ برعظیم کے مسلمانوں کو قومی کاموں کے لیے چندہ مانگنے کی ضرورت اور عادت حکومت کھونے کے بعد پڑی۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلمان مسلسل کشکول اُٹھائے پھرتے رہے۔ قوم کی خاطر ایک غریب دوسرے غریب سے مالی امداد کی التجاء کیا کرتا تھا۔ سرسید کی مشکل یہ تھی کہ وہ انگریزی تعلیم کے لیے چندہ مانگتا تھا۔ مانگنے والا ملحد، مقصد اس کا مذموم۔ اس کے باوجود کامیاب رہا۔ تین مرتبہ مسلمانوں نے پورے برعظیم میں وسیع پیمانے پر چندہ جمع کرنے کی کامیاب مہم چلائی تھی۔ سرسید کے مدرسہ کے لیے، تحریکِ خلافت کے لیے اور علی گڑھ میڈیکل کالج کے لیے۔''[۲۴]

علی گڑھ کے تناظر میں مختار مسعود نے سرسید احمد خان کا کردار اور بالخصوص کالج اور تعلیمی حوالے سے ان کی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ نو آبادیاتی نظام میں فوری طور پر انگریزوں کے ساتھ دست و گریباں ہونا مناسب نہ تھا جس کے سمجھتے ہوئے سرسید نے دورہ انگلستان سے واپسی پر مسلمانوں کی اصلاح کا فیصلہ عقلی سطح پر کیا اور مقصدیت کو فروغ دیتے ہوئے اصلاح پسندی کا رویہ اپنایا جس کے لیے اُنھوں نے رسالہ ''تہذیبُ اخلاق'' کا

اجراء کیا۔ چونکہ بر صغیر کے اندر مسلمانوں میں مختلف طبقات پیدا ہو چکے تھے جو انگریزوں کے براہ راست خلاف اور جنگ پر تُلے ہوئے تھے۔ ان طبقات کی جانب سے سر سید احمد خان کو بُرا بھلا کہنے کے ساتھ ساتھ ملحد اور اس کے مقاصد کو مذموم قرار دیا گیا۔

ان تمام وجوہات کے باوجود سر سید اور ان کے رفقاء نے رُوحِ عصر کو سمجھتے ہوئے مسلمانوں کے حقوق، اصلاح اور مستقبل کے لیے مکمل لائحہ عمل تشکیل دیتے ہوئے ان کی خود مختاری اور دو قومی نظریے کو بر صغیر پاک وہند میں رائج کیا۔ مختار مسعود نے ''حرفِ شوق'' میں کئی تاریخی واقعات و شخصیات کا تذکرہ پیش کرتے ہوئے اُس دور کے رُجحانات اور سیاسی شعور کو بیان کیا ہے۔ نو آبادیات کی صورتحال میں سانس لیتے مسلمان الگ وطن کی تگ ودو اور جدوجہد میں مصروف تھے کہ ان کی راہنمائی کرنے کے لیے قائداعظم میدان میں ائے اور الگ نظریے کی بدولت الگ وطن کی جستجو میں مسلمانوں کی راہنمائی اور قیادت کرنے لگے۔ ان کی کئی بار علی گڑھ آمد اور مسلمانوں کو سیاسی حوالے سے یکجا ہونے اور اپنا واضح سیاسی نصب العین پیش کرنے کے لیے اُنھوں نے مسلمانوں سے کئی وعدے لیتے ہوئے اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔

مختار مسعود قائداعظم کے سیاسی کردار کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

''قائداعظم نے علی گڑھ کے اسی تاریخ ساز سفر میں کہا تھا کہ پاکستان اس لمحے وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلے غیر مسلم نے اسلام قبول کیا تھا۔ زمانہ دراز سے ہندو اور مسلمان اکھٹے رہتے آئے ہیں مگر وہ ایک نہیں ہو سکے اور یہی حقیقت پاکستان کی اساس ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پاکستان کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے یہ باتیں بنانے سے نہیں ملے گا، منت کرنے سے نہیں ملے گا اور تو اور یہ محض مناجات سے بھی نہیں ملے گا اس کے لیے خُدا پر بھروسا رکھتے ہوئے جدوجہد کرنی ہو گی۔ ان شاء اللہ پاکستان اب تمہاری دسترس میں ہے۔ آج میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں تو ہر بار سجدہ شکر ادا کرنے کو جی چاہتا ہے۔''(۲۵)

مختار مسعود نے ''حرفِ شوق'' میں رُوحِ عصر اور مقامی حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریکِ علی گڑھ سے لے کر قیامِ پاکستان تک کے غالب رُجحانات اور رویوں کو قلمبند کیا ہے۔ نو آبادیات میں رہتے ہوئے الگ سیاسی

نظریے کی بدولت وطن کی جستجو اور سیاسی راہنمائی کرتے ہوئے عوام کو ایک نصب العین پر متفق کیا اور سیاسی جدوجہد کی بدولت الگ وطن حاصل کرنا تاریخی کامیابی ہے جس کو مختار مسعود نے تاریخی دستاویز کی حیثیت سے بیان کیا ہے ان حالات کا مطالعہ کرنے سے اس عہد کی رُوحِ عصر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ب: تاریخی و ثقافتی متن کا مطالعہ

مختار مسعود کی تحریریں جہاں فکری و فنی اعتبار سے اُردو ادب اور تاریخ کا اہم سرمایہ ہے وہاں پر مختار مسعود کی تحریریں تاریخی و ثقافتی متون کے اعتبار سے لسانی و ادبی حوالے سے بھی اہم سرمایہ ہے۔ تاریخی و ثقافتی دستاویز کی حیثیت اختیار کرتے ہوئے مختار مسعود کی تحریریں اپنے اندر تاریخی میلانات، رُجحانات اور تاریخی واقعات کے مرہونِ منت پیدا ہونے والی بڑی تبدیلیوں محرکات، اثرات کا تعین کرتی ہیں، جبکہ تاریخی حوالوں کے ساتھ ان کا متن ثقافتی اعتبار سے مختلف علاقوں، خطوں، ممالک مقامی و بین الاقوامی سطح پر تہذیب و ثقافت کا مطالعہ کرتی دکھائی دیتی ہیں، جدید تنقید میں لسانی اعتبار سے متنی تنقید کی اصطلاح اور مطالعہ اہم موضوع ہے۔ متن کا مطالعہ ایک طرف لسانی اعتبار سے کیا جاتا ہے تو دوسری جانب اس کا دائرہ کار ادبی سطح یعنی متن کا موضوع اس کے رموز و علامات اور داخلی و خارجی سطح پر اس کی اہمیت کے مطابق دیکھا جاتا ہے۔

مختار مسعود کی تحریریں جہاں لسانی اعتبار سے اُردو فارسی زبان کے محاورات، اشعار، الفاظ و جملوں سے بھرپور ہے وہاں ان کا متن موضوعاتی و ادبی اعتبار سے تاریخی و ثقافتی متن کا درجہ رکھتا ہے۔ جس کو پڑھنے سے تاریخی واقعات اور تہذیبی و ثقافتی عناصر کا بخوبی جائزہ لیا جاتا ہے۔ متنی تنقید کے بنیادی اُصول و قواعد پر اُردو ادب میں ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب ''متنی تنقید'' اہم ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''متنی تنقید ایک سائنس ہے، جس کا بنیادی مقصد متن کی تصحیح ہوتا ہے جس کے تحت اس متن کی بازیافت منظور ہوتی ہے جو منصف نے لکھا تھا۔ متنی تنقید کا فن مغرب کا مرہونِ منت ہے اس فن کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کے آغاز

میں ہوا۔یونانی اور لاطینی زبانوں کے متنوں اور بائبل کے تنقیدی اڈیشن تیار کر کے اس فن کی ضرورت پڑی تھی۔انیسویں صدی کے آغاز میں ''متنی تنقید'' کے موضوع پر کتابیں لکھی جانے لگیں۔''[۲۶]

ڈاکٹر خلیق انجم نے متنی تنقید کے حوالے سے لکھتے ہوئے کہا کہ اس کا بنیادی مقصد متن کی تصحیح ہوتا ہے کہ متن کی تخلیق کا سبب اس کا موضوع اس کی بازیافت کی منظوری جو مصنف نے لکھا ہوتا ہے۔متنی تنقید اور اس کے بنیادی مقاصد کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مختار مسعود کی تحریروں کا مطالعہ اور جائزہ لیا جائے تو مختار مسعود کا تخلیق کردہ متن اس حوالے سے اہم ہے کیونکہ ان کی تخلیق کردہ کتب میں تاریخ،سماج سیاست اور تہذیبی و ثقافتی رویوں کی پاداش میں معاشرے کے اندر اُبھرتی تبدیلیوں،عوامی تحریکات ان کا ردعمل،محرکات اور انقلابات کی بازیافت موجود ہے۔اس حوالے سے مختار مسعود کی کتب تاریخی و ثقافتی متون کا احاطہ کرتی ہیں۔

مختار مسعود کی کتاب ''حرفِ شوق'' میں تحریکِ علی گڑھ سر سید احمد خان کی خدمات اور برصغیر پاک و ہند کے حالات مختار مسعود نے اپنے زمانہ طالب علمی سے لے کر ایک سول سرونٹ بیوروکریٹ اور کئی ممالک کے سفر کرنے دوران ان کے مشاہدات و تجربات اور تاریخی اعتبار سے ان کے سامنے رونما ہونے والی تبدیلیوں کو اپنے تاریخی شعور کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے اپنی تخلیقات کا ذریعہ بنایا جو آج تک تاریخ،علم و ادب کے قارئین کے لیے تاریخی دستاویز،علمی و ادبی سرمایے کا موثر حوالہ ہے۔تاریخی متن کا حوالہ دیتے ہوئے مختار مسعود نے دوسری جنگِ عظیم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میں اپنے دورِ طالب علمی کو یاد کر رہا ہوں،چوتھی صدی قبل مسیح وہاں سے بہت دُور ہے۔دوسری جنگِ عظیم البتہ اس کے بہت قریب ہے۔جنگ شروع ہوئی۔چرچل ایوانِ زیریں کی ۶۳۶ نشستوں میں سے کسی ایک بے اہمیت نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔اس کی باری آئی تو اس نے کہا اس ایوان کے باہر جنگ کا ایک طوفان اُمڈ آیا ہے۔ہمارے وطن کی سرزمین کو اس تند موجوں کے قہر کا سامنا ہے،اس کے باوجود آج اتوار کی صبح ہمارے دل بالکل پر سکون اور مطمئن ہیں۔کیونکہ اس جنگ میں ہماری شرکت دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے،شاہنشاہیت کی توسیع اور مادی فوائد کے

حصول کے لیے نہیں ہے۔ یہ جنگ حقوق بشر کی بنیادوں کو ناقابلِ تسخیر چٹانوں پر قائم کرنے، انسانوں کو اس کے اصل مقام عطا کرنے اور انسانیت کی رفعت کو از سرِ نو حاصل کرنے کے لیے لڑی جا رہی ہے "[۲۷]

مختار مسعود کی تحریروں میں تاریخیت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں جس کا انداز چرچل کے ذکر سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ تاریخی شخصیت چرچل کے ساتھ منسلک کرتے ہوئے دوسری عالمی جنگ کے تناظر کو بخوبی پیش کرتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے پر فتن ماحول کے اندر چرچل کے تاریخی الفاظ ایوان کے اندر ایک ولولہ بیدار کرنے کا باعث بنے کیونکہ وہ یہ جنگ انسانیت کی رفعت کو بحال کرنے، انسان کے وقار اور انسانیت کے درجے کو پروقار بنانے کے لیے لڑ رہا تھا کیونکہ اس کے بقول یہ جنگ اسلحے کے زور، عالمی سطح پر غلبہ حاصل کرنے اور مادی سطح پر وسائل لوٹنے کے لیے نہیں لڑی جا رہی بلکہ انسانوں کو ان کا اصل مقام واپس دلانے اور انسانیت کی رفعت کو پامال ہونے سے بچانے اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے از سرِ نو تعمیر کرنے کے لیے جدوجہد جاری ہے۔

مختار مسعود نے برصغیر کے اندر سیاسی و سماجی حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے تاریخ کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑتے ہوئے کئی سیاسی و سماجی راہنماوں کا احوال تاریخی اعتبار سے بیان کیا ہے۔ جن کی جدوجہد کی بدولت برصغیر پاک و ہند میں ایک نئی تاریخ رقم ہوئی لیکن ان کی جدوجہد کے دوران کئی مواقع پر ان راہنماوں کو تکالیف و مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے پر زور مزاحمت اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

قائداعظم محمد علی جناح مسلمانوں کی آواز اور ان کی قیادت کرتے ہوئے سامنے آئے اور الگ سیاسی تشخص کی علامت بنے لیکن کئی علاقوں اور جگہوں پر انہیں مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ برعظیم کے مسلمانوں ے لیے اتحاد و امن کا پیغام لے کر گلی گلی جانا پڑا لیکن لوگوں کا طرزِ عمل بے رُخی کی صورت میں سامنے آیا۔ مختار مسعود نے قائداعظم کی اس جدوجہد اور سیاسی حوالے سے تاریخ کے دھارے کو بدلنے کے لیے عملی جدوجہد اور عوام کی بے رُخی کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”قائد اعظم نے جب انگلستان سے واپس آ کر کام کی ابتداء کی تو کیا اپنے کیا پرائے،سب مخالف ہو گئے۔وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ محمد علی جناح بر عظیم کے مسلمانوں کے اتحاد کا پیغام لے کر جس صوبے میں پہنچے وہاں انہیں بے رُخی کا سامنا کرنا پڑا۔ایک بڑے شہر میں استقبالیہ کمیٹی کے ممبر ریل گاڑی آ جانے کے بعد پہنچے۔اس وقت تک آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر اور سیکرٹری پلیٹ فارم پر ٹہلتے رہے۔ایک بار چند کالی جھنڈیوں والے دوسروں سے پہلے استقبال کے لیے پہنچ گئے۔لاہور کی صورتِ حال یہ تھی کہ وہاں کے بیمار مگر بارسوخ وزیر اعلیٰ کے ڈر کے مارے لوگ مسلم لیگ کو شہر میں ہال مہیا کرنے سے انکاری تھے۔“[۲۸]

مسلمانوں کو اپنے الگ سیاسی تشخص اور جدوجہد کے لیے کئی مشکلات و تکالیف کا سامنا رہا۔ قائد اعظم کو اس دوران مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔لیکن ان کے جذبے اور حوصلے بلند رہے اُنھوں نے عوام کو تنہا نہ چھوڑا بلند و مضبوط ارادوں سے میدانِ عمل میں رہتے ہوئے الگ سیاسی تشخص کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے دکھائی دیے۔تاریخ کا تسلسل مسلسل جاری رہا اور ان مخالفین کی مخالفت کے باوجود برصغیر پاک وہند میں مسلم لیگ اس کا منشور لوگوں میں اپنی جگہ بنانے لگا قائد اعظم کی حامیت اور آواز میں اضافہ ہوتا چلا گیا آخر کار برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کو الگ وطن کی جستجو کا صلہ پاکستان کی صورت میں ملا تاریخ کے نقشہ پر پاکستان مسلمانوں کے الگ قومی،وطنی،مذہبی سیای وسماجی حقوق کی آزادانہ فراہمی کے ساتھ ابھرا۔

ج: مختار مسعود کی کتاب ”حرفِ شوق“ میں سیاسی وسماجی واقعات کا اجمالی جائزہ

مختار مسعود کی تحریریں تاریخی اعتبار سے اہم ہونے کے ساتھ سیاسی حوالے سے رونما ہونے والی تبدیلیوں اور اس سلسلے میں معاشرے کے اندر قائم ہونے والے نظام جمہوری و آمرانہ رویوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔مختلف ممالک،علاقوں کا سفر اور وہاں قیام کے دوران تاریخ کو بنتے،بدلتے دیکھا جس کو بعد میں اپنی تحریروں اور کُتب کا حصہ بناتے ہوئے مکمل تاریخی وسیاسی دستاویز کا درجہ فراہم کیا۔

مختار مسعود کی کتاب "حرفِ شوق" ایسے مضامین پر محیط ہے جو زیادہ تر علی گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مختار مسعود نے زندگی کا بیشتر حصہ علی گڑھ میں گُزارا، علیگ ہونے کی صورت میں مسلمانوں کی الگ وطن کی خاطر جدوجہد اور علی گڑھ کا تحریکِ پاکستان میں نمایاں حصہ رفقاءوراہنماوں کی علی گڑھ کی نمائندگی کی صورت میں تحریکِ علی گڑھ سے لے کر تحریکِ پاکستان تک جدوجہد اور اس جدوجہد کے صلہ میں قیامِ پاکستان تک کا یادگار سفر قلمبند کرتے ہوئے ان کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا اور تاریخ کے بننے کا عمل بڑے سیاسی معرکوں، تبدیلیوں، تحریکات، انقلابات کی صورت میں حرفِ شوق کا حصہ بنایا۔

مختار مسعود نے "حرفِ شوق" میں سیاسی و سماجی واقعات ان کے محرکات نتائج اور اثرات کو پیش و بیان کرنے کے ساتھ علمی وادبی صورتحال کی عکاسی کی ہے جہاں اُنھوں نے اُردو ادب میں تخلیق ہونے والے فن پاروں، نثر و شاعری، مصنفین، نظریات اور ادبی رُجحانات کو اپنے تاریخی و ادبی شعور کی بدولت بیان کیا ہے۔ سیاسی واقعات کی بازگشت سُناتے ہوئے مختار مسعود لکھتے ہیں کہ:

"۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء برعظیم کے مسلمانوں کی تاریخ کے دو اہم سنگِ میل ہیں۔ ان کے درمیانی فاصلے کو مسلمانوں نے دو تحریکوں کے وسیلے سے بخیر وخوبی طے کیا تھا۔ ایک تحریکِ علی گڑھ اور دوسری تحریکِ پاکستان۔ ان سرکردہ مسلمانوں کو جنھوں نے ان میں سے کیس ایک کازمانہ پایا، میں صرف اس معیار سے جانچتاہوں کہ آیاانہوں نے اپنے وقت کی قومی تحریک کی اہمیت کو پہچانااور اس میں حصہ لیایااپنی کھال اور اپنے حال میں مست رہے۔"(۲۹)

مختار مسعود نے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور دو بڑی تحریکوں کا دور قرار دیا ہے۔ ایک تحریکِ علی گڑھ اور دوسری تحریکِ پاکستان دونوں کا وجود میں آنا برصغیر پاک وہند کے لیے سود مند ثابت ہوا۔ نو آبادیاتی نظام کے تحت برصغیر پاک وہند کے لوگ محصور ہو کر رہ گئے تھے وہ اپنی الگ مذہبی، سیاسی، معاشرتی آزادانہ زندگی بسر کرنے کے خواہش مند تھے لیکن یہ رویہ وقت کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ رُجحان اور بعدازاں تحریک کی صورت میں وجود پذیر ہوااور سرسید کی عقلی راہنمائی کی بدولت عملی سطح پر برتری حاصل کرنے کے لیے تعلیمی اداروں کا قیام اور مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنا تاکہ وہ ہر میدان میں انگریزوں کا مقابلہ کرتے

ہوئے اپنے الگ سیاسی منشور کی بدولت واضح حکمت عملی اپناتے ہوئے انگریزوں کا مقابلہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کریں۔

تحریکِ علی گڑھ سے تحریکِ پاکستان تک کا سفر مشکل سفر تھا جس میں کئی مشکلات کا سامنا راہنماوں کو کرنا پڑا، زندان کی سیر کرنی پڑی، آزادی اظہار رائے پر قدغن لگی لیکن مسلمان یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اپنی قربانیاں دینے کے بعد اب اس راستے سے واپسی الگ وطن کے بغیر ممکن نہیں لہذا اس تحریک کو وقت کے بدلتے دھارے کے ساتھ تقویت ملتی رہی اور آزاد وطن کی صورت میں یہ تحریک کامیاب ہوئی۔ڈاکٹر سلیم اختر ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' میں علی گڑھ تحریک کا احوال قلمبند کرتے ہوئے رقطراز ہیں کہ:

''۱۸۵۷ء کا انقلاب بہت بڑا طوفان تھا لیکن سرسید تحریک بھی کسی طوفان سے کم ثابت نہ ہوئی۔ یہ ایسا طوفان تھا جس نے مسلم سماج کے تمام طبقات میں خیالات کی حیات بخش رو دوڑا دی۔ قدیم تصورات اور فرسودہ عقائد خس و خاشاک کی طرح اڑائے اور آنے والے عصر کے لیے اندازِ نو کی نوید بھی دی اور واضح رہے کہ سب سے پہلے سرسید ہی نے یہ محسوس کیا تھا کہ مسلمانو اور ہندوں کا مل جل کر رہنا ناممکن ہے گویا پاکستان کی خشتِ اول بھی سرسید ہیں۔ چنانچہ سرسید اور ان کے رفقائے کار کی جہد مسلسل سے تعلیمی، سماجی اور ادبی مورچے تسخیر ہوئے اور ان پر افکارِ نو کے پرچم لہرا دیے گئے۔''(۳۰)

ڈاکٹر سلیم اختر نے ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' میں سرسید کی خدمات اور تحریکِ علی گڑھ کو مسلمانوں کی آزادی کا پیش خیمہ قرار دیا۔ اجتماعی طور پر مسلمانوں کا ایک پلیٹ فارم الگ نمائندگی اور عقلی سطح پر آزادی کی راہ پر گامزن کرنے والے سرسید تھے جنھوں نے مذہبی، تعلیمی سیاسی و سماجی اعتبار سے مسلمانوں کو جہدِ مسلسل کی بدولت متفق کرتے ہوئے یہ راہ دکھائی، جس پر چلتے ہئے وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے اور برصغیر میں انگریزوں سے چھٹکارہ حاصل کیا اور پاکستان کی عملی شکل میں دُنیا کے نقشہ پر اپنے وجود کو الگ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نام سے ثابت کیا۔

مختار مسعود نے اپنی تحریروں میں برصغیر کے علمی وادبی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج اور انگریزوں کے برصغیر میں قدم جمانے کے بعد مقامی زبان سیکھنے اور علمی و ادبی سرمایے کو اُردو میں منتقل کرنے اس کے پس پردہ مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ انگریزوں نے طویل قیام کی غرض سے برصغیر کی مقامی زبان سیکھنے یہاں کے رسم ورواج کو سمجھنے یہاں کے لوگوں کا طرزِ عمل، فکر و سوچ رویوں کو پرکھنے کے لیے ایک مکمل لائحہ عمل بنایا جس کے تحت کئی کتابوں کے تراجم کروائے گئے بہت سے لوگ اس مقصد کے حصول کے لیے بھرتی کیے گئے اور ان کو معقول معاوضہ فراہم کیا گیا لیکن پس پردہ حقائق و مقاصد کے باوجود مختار مسعود کے نزدیک فورٹ ولیم کالج کے قیام کے باعث اُردو نثر کو فروغ حاصل ہوا اور کئی عظیم نثری فن پارے وجود میں ائے جس سے اُردو زبان و ادب کو وسعت حاصل ہوئی، مختار مسعود اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''فورٹ ولیم کالج میں اُردو نثر پر جو کام بھی ہوا وہ کمپنی کے عملہ کو اُردو سکھانے کے نام پر ہوا حالانکہ بہت سے تحریروں کا نصاب سے تعلق قائم کرنے کے لیے ہمیں بہانے ڈھونڈنے پڑیں گے۔ وہ دعوٰی جو کالج کے پہلے سالانہ جلسے کی موقع پر کیا گیا تھا کہ اس ادارہ سے بے انتہا فوائد مرتب ہو رہے ہیں محض ایک پیش بندی تھی کہ بورڈ آف ڈائریکٹرز سے باقاعدہ منظوری حاصل ہو جائے۔ جب کالج جاری رکھنے کی اجازت نہ ملی تو یہ دھمکی دی گئی کہ کالج کو قائم رہنا ہو گا ورنہ سلطنت ختم ہو جائے گی''[۳۱]

اُنھوں نے فورٹ ولیم کالج میں اُردو نثر، انگریزوں کے مقاصد، طویل طرزِ حکمرانی کے خواب اور مقامی تہذیب و ثقافت، علمی و ادبی مباحث سے آشنائی کے لیے اُٹھائے جانے والے اقدامات کا تجزیاتی جائزہ پیش کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کے ساتھ مختار مسعود نے جہاں سیاسی و سماجی واقعات کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے وہاں پر اُردو زبان و ادب، نثری و شعری اصناف اور ادبی سرمایے پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے اچھی نثر کی خصوصیات برصغیر پاک وہند کے تناظر میں بیان کی ہیں۔

وہ علی گڑھ میں رہتے ہوئے پرُفتن ماحول کے اندر اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھیں اور ادبی ذوق کی تسکین کے لیے کئی ادباء کو پڑھا، مقرر اچھے رہے، علمی و ادبی محافل میں شرکت کی لہٰذا ان کا ادبی ذوق کمال کا تھا تاریخی و ادبی شعور عمدہ تھا جس کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے تقابلی ادب اور عالمی ادب سے لگاو حاصل کیا اور تصنیف و تالیف کی طرف گامزن ہوئے، اُردو نثر کے بارے میں مختار مسعود نے لکھا کہ:

''اُردو نثر کو دو بڑی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک عادی رواجی اور دوسری علمی و ادبی، عادی رواجی نثر عام استعمال میں آنے والی نثر ہے۔ زندگی کے بیشتر کام یہی نثر کرتی ہے۔ مدرسہ بازار، دفتر، ہر جگہ اس کی عمل داری ہے۔ مسجد میں عربی کے بعد اور کارِ سرکار میں انگریزی کے بعد اسی کی باری آتی ہے۔ ابلاغ اور تفریح کے تمام ذرائع، اخبار، سینما، تھیٹر، ریڈیو، ٹی وی سب کار آمد اور ہر وقت مصروف صنفِ نثر کا سہارا لیتے ہیں۔ لے دے کر علم و ادب کا میدان رہ جاتا ہے، جہاں اس کا داخلہ ممنوع ہے۔ علمی و ادبی نثر کا دائرہ کار عادی رواجی نثر سے کم ہونے کے باوجود بہت وسیع ہے۔ تاریخ، تفسیر، تنقید، مضامین، انشائیہ، افسانہ، ناول اور سوانح لکھنے کے علاوہ اور بہت سے کام اس نثر سے لیے جاتے ہیں'' (۳۲)

مختار مسعود نے ''آوازِ دوست'' سے لے کر ''حرفِ شوق'' تک اپنی تحریروں میں سیاسی و سماجی حالات، مقامی تہذیب و ثقافت کا بیان، علمی و ادبی رُجحانات، تاریخی واقعات، ان کے حقائق اثرات اور پس پردہ عوامل کو بیان کیا ہے۔ اُردو زبان و ادب کے حوالے سے دیگر زبانوں کے رشتے کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے طویل باب قلمبند کیا ہیں۔ جس میں اُردو ادب اور شعری و نثری تقسیم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ادبی و تاریخی شعور کی بدولت برصغیر پاک و ہند کے تناظر میں اور نو آبادیاتی نظام، فورٹ ولیم کالج کے زیرِ اثر تخلیق ہونے والے ادب پر سیر حاصل تجزیہ پیش کیا ہے۔

مختار مسعود نے تاریخی دستاویز کی حیثیت سے اپنے مشاہدات و تجربات کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔ تاریخ میں رونما ہونے والے واقعات کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے علمی و ادبی سطح پر اس کے اثرات کو بیان کیا ہے۔ عصری آگہی، تاریخی واقعات، علمی و ادبی رُجحانات، مقامی تہذیب و ثقافت کے ساتھ جہاں وہ اپنے

فرائضِ منصبی کی غرض سے گئے وہاں کے حالات کو تقابلی سطح پر بیان کیا۔ ان کی کتب علمی و ادبی حوالے کے ساتھ تاریخی حوالے سے ایک مکمل دستاویز کی حیثیت اختیار کرتی ہیں۔ جس میں تاریخ، مذہب، سماج، معاشرت، علمی و ادبی سرمایے سے واقفیت ملتی ہے۔ جو ماضی، حال اور مستقبل کے رشتے سے منسلک متون کا احاطہ کرتی ہے۔

حوالہ جات (باب سوم)

۱۔ مختار مسعود، لوحِ ایام، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، ۱۹۹۶ء، صفحہ ۰۷

۲۔ ایضاً، صفحہ ۳۶

۳۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، ڈاکٹر، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، ۲۰۱۸ء، صفحہ ۱۶۵

۴۔ مختار مسعود، لوحِ ایام، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، ۱۹۹۶ء، صفحہ ۴۷

۵۔ ایضاً، صفحہ ۲۱

۶۔ امر شاھد، صاحبِ آوازِ دوست (ترتیب و تدوین)، بُک کارنر جہلم، صفحہ ۱۰۶

۷۔ مختار مسعود، لوحِ ایام، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، ۱۹۹۶ء، صفحہ ۴۰

۸۔ ایضاً، صفحہ ۷۸

۹۔ ایضاً، صفحہ ۵۲

۱۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۵

۱۱۔ روف پاریکھ، ڈاکٹر، کالم، لوحِ ایام پر نقشِ آوازِ دوست کا سفر نصیب ہوا، روزنامہ جنگ، راولپنڈی، ۱۹، اپریل ۲۰۱۷ء

۱۲۔ خرم سہیل، تاریخ کا چشم دید گواہ، مختار مسعود، کالم، روزنامہ نوائے وقت، اسلام آباد، ۱۵ مئی ۲۰۱۷ء

۱۳۔ مختار مسعود، لوحِ ایام، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، ۱۹۹۶ء، صفحہ ۳۲۳

۱۴۔ ایضاً، صفحہ ۶۳

۱۵۔ سبطِ حسن، ڈاکٹر، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال، ۲۰۱۷ء، صفحہ ۱۷

۱۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۹

۱۷۔ شہید صفی پوری، ایران کا اسلامی انقلاب اور اس کا ردِ عمل، کازوے بک سنٹر، دہلی ۱۹۹۶ء، صفحہ ۱۴۴

۱۸۔ مختار مسعود، لوحِ ایام، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، ۱۹۹۶ء، صفحہ ۲۵

۱۹۔ ایضاً، صفحہ ۴۲۱، ۴۲۰

۲۰۔ سبطِ حسن، ڈاکٹر، انقلابِ ایران، مکتبہ دانیال، ۱۹۹۶ء، صفحہ ۲۵۲

۲۱۔ مختا مسعود، حرفِ شوق، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، ۲۰۱۷ء، صفحہ ۱۰

۲۲۔ علی عباس جلال پوری، ڈاکٹر، روحِ عصر، فنون، لاہور شمارہ مئی جون، ۱۹۶۵ء، صفحہ ۲۸

۲۳۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، ۲۰۱۷ء، صفحہ ۱۴

۲۴۔ ایضاً، صفحہ ۳۹

۲۵۔ ایضاً، صفحہ ۱۴۲، ۱۴۱

۲۶۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، انجمن ترقی اُردو، کراچی، پاکستان، ۲۰۱۴ء، صفحہ ۲۳

۲۷۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، ۲۰۱۷ء، صفحہ ۱۵۹

۲۸۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۵

۲۹۔ ایضاً، صفحہ ۱۹۱

۳۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۸، صفحہ ۳۲۲

۳۱۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، ۲۰۱۷ء، صفحہ ۴۸۷

۳۲۔ ایضاً، صفحہ ۵۰۲

(باب چہارم)

مجموعی جائزہ

نتائج

سفارشات

مجموعی جائزہ:

تاریخ ایک مسلسل عمل اور تغیر کا نام ہے۔ وقت کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ جہاں جدید مکتبہ فکر، مباحث اور نظریات جنم لے رہے ہیں، وہاں تاریخ کا تسلسل جاری و ساری ہے۔ تاریخی تغیر کی بدولت مختلف شعبہ ہائے زندگی نئی راہیں متعین کرنے کے ساتھ ماضی، حال اور مستقبل کے رشتوں کو باہم مربوط کرتے ہوئے علمی و ادبی سطح پر کئی بڑی تبدیلیوں سے روشناس ہوئے ہے۔ ان تاریخی واقعات، انقلابات، سیاسی و سماجی تغیر کے نام پر معاشرے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ ان حالات کا اظہار وقت کے ساتھ ساتھ اُردو زبان و ادب کے تخلیق کاروں کے ہاں ان کے تخلیقی فن پاروں میں نظر آیا ہے۔ ان واقعات کے پس پردہ عوامل، اثرات اور موجودہ سیاسی و سماجی صورتحال کے تناظر میں عصرِ حاضر کا مطالعہ ناگریز ہے۔

ادب کو پرکھنے اور سمجھنے کے لیے جہاں مختلف قدیم و جدید علمی و ادبی مباحث اور تھیوریاں منظرِ عام پر آچکی ہیں وہاں ادباء کا تاریخی شعور اور اس کے زیرِ اثر ان کی تخلیقات کا مطالعہ بھی علمی و ادبی مباحث کا جدید موضوع ہے۔ مغرب میں اس کے لیے تاریخیت کی اصطلاح رائج ہے، جس کا مفہوم بنیادی طور پر تاریخ کا ادارک ، تاریخ کا تسلسل و تغیر اور اس کے معاشرے پر علمی و ادبی اثرات کا مطالعہ کرنا ہے۔ اُردو ادب میں اس

موضوع پر کئی ادباء نے قلم اُٹھایا ہے اور اپنے تاریخی شعور کی بدولت اس کے اثرات کو بیان کیا ہے۔ وہی مختار مسعود نے اپنی تحریروں میں تاریخیت اور اس کے تمام تناظرات کو پیش کیا ہے۔

مختار مسعود نے آغاز سے ہی نو آبادیاتی نظام میں آنکھ کھولی جہاں انُھوں نے برصغیر کی سیاسی و سماجی صورتحال، جدوجہد اور تاریخ کو بنتے ہوئے دیکھا جس کے بعد اُنھوں نے علمی و ادبی سطح پر اسے تاریخی دستاویز کی حیثیت سے اپنی تحریروں کا حصہ بنایا اور ان کی پہلی کتاب ''آوازِ دوست'' منظرِ عام پر آئی۔ مختار مسعود نے چار کتابیں تحریر کی ہیں ان کی تحریروں میں ملکی، علاقائی، سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی، مذہبی، علمی و ادبی اور تاریخ کے تناظر میں ان اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ رویہ، رُجحان اور بعد ازاں ان کا تحریک کی صورت میں اُبھرنا، اپنے قدم جمانا اور بڑے انقلابی معرکہ میں فتح حاصل کرنے کے بعد تاریخ رقم کرنے کی لازوال داستانیں، ان کے اثرات ملکی و علاقائی سطح کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر دکھائی دیتے ہیں۔

مختار مسعود کے اسلوب کی دل کشی اور انفرادیت کی بدولت دقیق موضوعات کو سمجھنا قابلِ فہم ہے۔ مختار مسعود کا تخلیقی آہنگ، جملوں کا ربط و موقع محل کے مطابق استعمال، موضوع کا بیان و اظہار علمی و ادبی سطح پر انہیں دیگر سے ممتاز کرتا ہے۔ مختار مسعود کا فکری خمیر، علی گڑھ، نو آبادیات اور سیاسی نظاموں کے انہدام سے اُٹھا ہے۔ اُن کی تحریروں کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جائے تو ''آوازِ دوست'' سے ''حرفِ شوق'' کے کینوس تک ان کی تحریروں میں تاریخ کا تسلسل دکھائی دیتا ہے۔ ''آوازِ دوست'' میں مختار مسعود نے تاریخی تغیرات کو برصغیر کی سیاسی و سماجی صورتحال کے تناظر میں پرکھا ہے، علاوہ ازیں موجودہ عہد میں عظیم انسانوں کی نا پیدگی کو موضوع بنایا ہے۔

مختار مسعود نے اپنی دوسری کتاب ''سفر نصیب'' میں جہاں علاقائی سطح پر تاریخی و سیاسی منظر نامے کو بیان کیا ہے وہاں پر ہی اُنھوں نے دو اہم خاکے تحریر کرتے ہوئے سفر نامہ اور خاکہ دونوں کے امتزاج سے اُردو زبان و ادب کے نثری سرمائے میں قابلِ قدر تجربہ اور اضافہ شامل کیا۔ جہاں سفر نامہ اور خاکہ دونوں کا امتزاج موجود ہے وہاں اردو ادب میں ایسا فن پارہ اپنی نوعیت میں انفرادیت کا حامل ہے۔ مختار مسعود نے تاریخی شعور

اور تاریخیت کے عناصر کی روشنی میں اپنی تحریروں میں تاریخ کے تسلسل کو بخوبی بیان و پیش کیا ہے۔ ان کی کتاب "لوحِ ایام" انقلابِ اسلامی کی تاریخی دستاویز ہے۔ مختار مسعود نے اپنے قیام کے دوران ایرانی سیاست اور اس کے اُتار چڑھاو کو بڑے قریب سے دیکھا۔ رضا شاہ پہلوی کی بادشاہت کے خاتمے کے ساتھ ایران میں نئے سیاسی و سماجی نظام کی قیام پذیری، ایرانی عوام کی جدوجہد اور انقلابِ اسلامی کے اثرات کو نہ صرف علاقائی بلکہ بین الاقوامی سطح کے حوالے سے پیش کیا ہے۔

مختار مسعود کی تحریروں میں تنوع، غیر جانبداری، علمی و ادبی ذوق، تاریخ سے واقفیت، تاریخی شعور کی بلند سطح، اقدار کا فروغ، ملی و قومی سطح پر ان کا اظہار بدرجہ اتم موجود ہے۔ علی گڑھ، تحریکِ پاکستان، قیامِ پاکستان، انقلابِ ایران (انقلابِ اسلامی) برصغیر پاک و ہند کے علمی و ادبی مباحث، ایران اور پاکستان کی تقابلی فضاء، علاقائی اور بین الاقوامی سیاسی و سماجی صورتحال، رُوحِ عصر، تحریکات کا ماحول، نتائج، نچوڑ، زبانوں کے ادبی سرمائے اور تاریخی تناظر کو مختار مسعود نے اپنی تحریروں کا حصہ بناتے ہوئے انہیں تاریخی دستاویز کا درجہ فراہم کیا ہے۔

مختار مسعود کی تحریروں میں تاریخ کا بیان، تاریخی شعور، عصری آگہی، سیاسی و سماجی شعور، انقلابات کا بیان ان کے پس پردہ حقائق اور ان کے ذاتی احساسات و تاثرات کا بیان ملتا ہے۔ مختار مسعود نے بیک وقت مورخ و ادیب کی حیثیت و لبادے میں اپنی تحریروں کو قارئین کے لیے پیش کیا جہاں تاریخ، تاریخی حالات و واقعات، عصری شعور کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی لوازمات اسلوب، محاورات، اشعار، مصرعے، جملوں کا برجستہ اظہار، مختلف اصنافِ نثر میں طبع آزمائی اور زبان و بیاں کے عمدہ استعمال کی بدولت کئی ممالک، علاقوں اور لوگوں کی تہذیب و ثقافت کو اُجاگر کیا ہے۔ ان کے اسلوب کی ایک خوبی موزانہ و تقابل کی فضا قائم رکھنا ہے۔ مختار مسعود کو جہاں بھی اپنے فرائضِ منصبی کے لیے منتقل ہونا پڑا اور اس غرض سے سکونت اختیار کرنی پڑی اُنھوں نے وہاں کے سیاسی و سماجی حالات کا تجزیہ اپنے تاریخی شعور کی بدولت مملکتِ خداداد پاکستان اور برصغیر کے سیاسی و سماجی پسِ منظر سے اس کا موازنہ و تقابل کیا۔ جس کی بدولت ان کی تحریروں میں ہر

علاقے، ملک و خطے کی بد و باش، رہن سہن، معاشیات، رسم و رواج، علمی و ادبی میلانات، سیاسی و سماجی صورتحال کی عکاسی کے ساتھ ساتھ تاریخیت کے عناصر کی روشنی میں تہذیب و ثقافت کا بیان ملتا ہے۔

مختار مسعود کی تخلیقات میں سماجی و ثقافتی عناصر کا اظہار، معاشرتی سطح پر ہونے والے حالات و واقعات، ان کے اثرات، طبقاتی کشمکش، حکمرانوں کا طرزِ سیاست، رعایا کا محکومی میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا، داخلی و خارجی عوامل کو نفسیاتی سطح پر بیان کرنا شامل ہے۔ مختار مسعود کی زندگی کئی ہنگاموں کا پیش خیمہ رہی جن کا اظہار ان کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔ اس حوالے سے مختار مسعود کی اُردو نثر کا مطالعہ اور تجزیاتی جائزہ ماضی، حال اور مستقبل کے رشتے، اقوام کی ترقی و تنزلی، تاریخ کے بیان، تہذیب و ثقافت کے بیان، علاقائی و بین الاقوامی حالات اور علمی و ادبی مباحث کے حوالے سے کار آمد ثابت ہوتا ہے۔ جو تاریخ کے طالبِ علم سے لے کر موجودہ عہد تک ہر قاری کے لیے تاریخی دستاویز کی حیثیت کے ہمراہ علاقائی و بین الاقوامی منظر نامے کو بیان کرنے کا موجب ہے۔ جن کے مطالعہ کی بدولت ایک نباض شناس ادیب و مورخ کی تحریر سامنے آتی ہے جو اردو زبان و ادب کا لازوال علمی و ادبی سرمایہ ہے۔

تحقیقی نتائج:

تاریخیت، مباحث و اطلاق: مختار مسعود کی اُردو نثر کے مطالعہ سے جو نتائج سامنے آتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مختار مسعود کی نثر تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتی ہے ان کی تحریروں کے مطالعے سے نہ صرف برصغیر بلکہ ایران کے سیاسی نظام کے خدوخال، انہدام اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی عصری صورتحال کی عکاسی ملتی ہے۔

۲۔ مختار مسعود کی تحریروں میں ایسے اکابرین اور شخصیات کا اظہار بکثرت آیا ہے جنہوں نے قوموں کی سیاسی و سماجی، علمی و ادبی تاریخ کا دھارا بدلا ہے۔

۳۔ مختار مسعود کی تحریروں میں تہذیبی و ثقافتی عناصر کا اظہار ملتا ہے۔ جو معاشرے میں رہنے والی مختلف اقوام، لوگوں اور ہر رنگ و نسل کی عوام ان کے رسوم و رواج کی عکاسی کرتا ہے۔

۴۔ تاریخ کا تسلسل و تغیر، جمہور و آمرانہ رویوں کی جنگ، طبقاتی کشمکش اور اقوام کی عروج و زوال کی داستانیں ان کی تحریروں کا خاصا ہے۔

۵۔ مختار مسعود کی تحریریں ماضی حال اور مستقبل کے حالات کا پیش خیمہ ہیں۔ جو مختار مسعود کے تاریخی شعور کی بدولت قاری کو حقائق کی منتقلی میں کارگر ثابت ہوتا ہے۔

۶۔ مختار مسعود کے ہاں ہمیں تحریکِ علی گڑھ اس کی سیاسی، سماجی اور علمی و ادبی حیثیت اور قیامِ پاکستان میں اس کے کردار کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

سفارشات:

۱۔ مختار مسعود کی تحریروں میں شخصیات کے سوانحی حالات بکثرت ملتے ہیں، اس اعتبار سے خاکہ نگاری کے ضمن میں ان کی تحریروں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ نو آبادیاتی نظام کے تحت ان کی نثر کو الگ سے مکمل طور پر علمی و تحقیقی سطح پر، پرکھنے کی ضرورت ہے۔ ۴۔ تاریخیت کے تناظر میں مختار مسعود کی تحریروں کا نہ صرف مقامی ادب بلکہ عالمی ادب سے بھی تقابلی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ مختار مسعود کے ہاں سیاسی شکست وریخت کا نوحہ سُنا جاسکتا ہے، اس پسِ منظر میں مشرقی پاکستان کے قیام اور اس کے اثرات کا مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

ضمیمہ

انٹرویو: ڈاکٹر منزہ احتشام گوندل

(پرنسپل، گورنمنٹ ایسوی ایٹ کالج برائے خواتین، کوٹ مومن، سرگودھا)

علی حسن: السلام علیکم!

منزہ احتشام: وعلیکم السلام!

علی حسن: میم کیسے مزاج ہیں؟

منزہ احتشام: الحمد اللہ! سب خیر وعافیت ہے۔

علی حسن: میم آج کی نشت مختار مسعود کی علمی وادبی اور تاریخی حیثیت کے بارے میں آپ سے رائے لینا تھی۔

منزہ احتشام: جی جی ضرور، یہ میرے لیے بھی اعزاز ہے کہ مجھے مختار مسعود جیسی شخصیت کے بارے میں آج رائے دینے کا موقع میسر آیا۔

علی حسن: مختار مسعود کی شخصیت کے کن افکار سے آپ متاثر ہیں؟

منزہ احتشام: مختار مسعود کی شخصیت ایک مکمل عہد کا نام ہے۔ جس میں ہم بر صغیر پاک وہند کے سیاسی وسماجی حالات کا بخوبی احاطہ کر سکتے ہیں۔ مجھے مختار مسعود کا طرزِ اظہار پسند ہے جس سے ہر قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا یہ اظہار ان کے افکار کو بآسانی بیان کرنے کا ذریعہ ہے۔

علی حسن: تاریخی شعور کے بارے میں آپ مختار مسعود کی شخصیت کو کس انداز سے بیان کر سکتی ہیں؟

منزہ احتشام: معاشرے میں رہنے والا ہر شخص تاریخ کا فہم کسی نہ کسی تناظر میں رکھتا ہے۔ لیکن تاریخ کا فہم اس کی شخصیت، معاشرے کے ربط کے ساتھ کس طرح پروان چڑھتی ہے یہ سوال زیادہ اہم ہے۔ مختار مسعود

کئی سرکاری عہدوں پر کام کرتے رہے ہیں تاریخ کو بدلتے دیکھا، انقلابات کے چشم دید گواہ رہے لہٰذا میرے نزدیک ان کا تاریخی شعور پختہ تھا کیونکہ وہ خود تاریخ دان کے ساتھ ساتھ صاحبِ طرزِ اسلوب نگار ادیب تھے۔

علی حسن: مختار مسعود کی کتب میں آپ کی پسندیدہ کتاب کون سی ہے اور کیوں؟

منزہ احتشام: مختار مسعود کی ویسے تو تمام کتب پڑھنے کے لائق ہیں البتہ میری پسندیدہ کتاب "آوازِ دوست" ہے۔ جس کے اثرات زمانہِ طالبِ علمی سے لے کر آج تک میری شخصیت میں موجود ہیں۔ یہ کتاب جہاں اسلوب کی چاشنی رکھتی ہے وہاں ہمیں برصغیر کی تاریخی و سیاسی منظر نامہ اس انداز سے بیان کرتی ہے کہ ہم اس عہد میں رہتے ہوئے بھی برصغیر کی فضا میں سانس لیتے ہیں۔

علی حسن: چونکہ میرا موضوع تاریخیت کے تناظر میں مختار مسعود کی تحریروں کا مطالعہ ہے تو اس بارے میں مختار مسعود کی شخصیت پر روشنی ڈالیں۔

منزہ احتشام: علی! موضوع کا انتخاب عمدہ ہے لیکن یہ وسعت کا حامل ہے۔ مختار مسعود کی تحریریں تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں جبکہ تاریخیت جدید تنقیدی رویہ ہے جو تاریخ کے فہم اور مطالعے کا نام ہے جس میں قاری محض متن تک محدود نہیں رہتا بلکہ متن کی تخلیق میں کارفرما ان عوامل کا مطالعہ بھی زیرِ بحث رہتا ہے جو متن کی تخلیق کا باعث بنے۔ ایسے حالات ہمیں بہ کثرت مختار مسعود کے عہد میں دکھائی دیتے ہیں جو تاریخیت کے موضوع سے مطابقت رکھتے ہیں۔

علی حسن: انقلابِ اسلامی اور مختار مسعود کی کتاب "لوحِ ایام" کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

منزہ احتشام: لوحِ ایام ایک تاریخی سفر نامہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں مختار مسعود نے چشم دید گواہ کی حیثیت سے انقلابِ اسلامی کو دیکھا اور رضا شاہ پہلوی کے غرور و تکبر، جبر و تشدد پر مبنی سورج کو غروب ہوتے دیکھا۔ یہ کتاب ہمیں تاریخی کُتب کا درجہ رکھتے ہوئے ادب کے اثرات دونوں معاشروں، برصغیر اور ایران کی صورتحال کی عکاسی کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

علی حسن: مختار مسعود کی شخصیت کے بارے میں چند اہم گُزارشات جو میری تحقیق کا احاطہ بھی کریں آپ کی نظر میں کیا ہیں۔

منزہ احتشام: ان کی تحریروں کا مطالعہ بار بار کریں۔ تاریخیت کی بنیادی کتب کو پڑھیں اپنے اساتذہ سے راہنمائی لیتے ہوئے یہ تحقیقی سفر طے کریں۔ اس دوران تحقیقی و تنقیدی دشواریوں کو اپنے علمی و ادبی فہم کے ساتھ حل کریں۔ مختار مسعود کی تحریروں کو عصری آگہی، سیاسی و سماجی شعور کے تناظر میں آج کے دور کے ساتھ تقابل بھی کریں۔ یہی تاریخیت کے تناظر میں آپ کے لیے کارآمد ثابت ہونگے۔

علی حسن: میم آپ کا مجھے ہمیشہ کی طرح وقت دینے کا شکریہ!

منزہ احتشام: جیتے رہیں، سلامت رہیں، نیک تمنائیں آپ کے لیے آپ کے تحقیقی سفر کے لیے، مجھے بھی اس بات کی خوشی ہے کہ آپ نے میرا انتخاب کرتے ہوئے مجھے مختار مسعود کی شخصیت پر رائے کا اظہار کرنے کا موقع دیا۔ شکریہ!

انٹرویو: ڈاکٹر قاسم یعقوب

(لیکچرار، شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد)

علی حسن: السلام علیکم سر!

قاسم یعقوب: وعلیکم السلام!

علی حسن: سر! بہت نوازش، آپ نے وقت دیا۔ آج کی ملاقات بالخصوص میرے تحقیقی مقالے کی مناسبت سے ہو رہی ہے۔ جس میں مختار مسعود کی تحریروں کو تاریخیت کے تناظر میں زیرِ بحث لایا جائے گا۔

قاسم یعقوب: جی! آپ کا بھی شکریہ! آپ ہمیشہ اسی محبت و خلوص کے ساتھ میرے پاس آتے ہیں جیسے میں آپ کو بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی میں پڑھایا کرتا تھا۔ یہ تعلق آج بھی قائم ہے اس کی خوشی مجھے آج بھی ہے۔ آپ نے درست کہا، آپ تحقیقی سفر کے دوران انٹرویوز کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے میرے پاس آئے ہیں۔ امید ہے ہماری گفتگو پُر مغز ہو گی۔

علی حسن: سر! مختار مسعود کی شخصیت اور ان کی تحریروں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ مختصراً بیان کریں۔

قاسم یعقوب: دورِ طالب علمی سے مختار مسعود کی تحریروں سے تعلق قائم ہے۔ بالخصوص ان کی کتاب "آوازِ دوست" اس سلسلے میں مختار مسعود کے ساتھ میرا پہلا تعلق تھا۔ مختار مسعود کی تحریریں ماضی حال اور مستقبل کا ایک واضح پیغام ہے۔ جو ہر قاری کو ماضی کے دریچوں، حال کے پُر فتن حالات اور مستقبل میں کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ کرنے کی قوت فراہم کرتا ہے۔ کتاب وہ انقلابی سوچ پیدا کرتی ہے جو تلوار یا طاقت کبھی پیدا نہیں کر سکتی۔ تاریخی دستاویز کی صورت میں ان کی تحریریں پر پڑھنے والے پر اپنے نقش ثبت کرتی ہے۔ لازوال ماضی کی داستانوں کو پُر تاثیر اظہار میں سمونے کی قوت مختار مسعود کے قلم میں ہی ہے۔

علی حسن: مختار مسعود کا اسلوب بلند ہے یا ان کی فکر؟

قاسم یعقوب: مختار مسعود کے افکار، ان کا تاریخی شعور ہمیشہ سے ان کی تحریروں کا خاصا ہے۔ ادبی ذوق نے ان کی تاریخی اظہار پر مبنی تحریروں کو ادبی رنگ بخشا لہذا ادب اور تاریخ کا تعلق قائم رکھتے ہوئے مختار مسعود نے جو اسلوب اختیار کیا وہ مقفیٰ نثر پر مبنی تھا۔ جہاں ہمیں مختلف تلمیحات کا اظہار، اشعار کا موقع محل استعمال، تاریخ کے منظر نامے کو دل چسپ بناتا ہے۔

علی حسن: تاریخیت کے تناظر میں مختار مسعود کی تحریروں کو کس انداز سے دیکھتے ہیں۔

قاسم یعقوب: مغربی جدید تنقیدی رویوں میں محض متن کا مطالعہ ناکافی تصور کیا جانے لگا ہے۔ ادب اور تاریخ کے رشتے پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ لیکن عصری آگہی، تاریخی حالات کا ادب پر اثر انداز ہونا، قاری اور مصنف کے تعلق، مصنف کا حالات سے متاثر ہونا اہم موضوع ہے۔

تاریخیت بنیادی طور پر ان متون کے مطالعے کا نام ہے جو اس دور کے سیاسی و سماجی عوامل، تاریخی شعور، ثقافتی متون کا احاطہ کرتی ہے۔ جس دور میں وہ ادب تخلیق کیا گیا۔ مختار مسعود کی بیشتر تحریریں اُٹھا کر دیکھیں وہ انہی عوامل کے گرد گھومتی دکھائی دیتی ہیں۔ لہذا اس تناظر میں آپ تحقیقی سفر کے دوران کافی مواد حاصل کر سکتے ہیں۔

علی حسن: غیر افسانوی نثر کے اعتبار سے مختار مسعود کی تحریریں تاریخی اعتبار سے تقابلی سطح پر دیکھی جاہیں تو ان کا تقابل کن ادباء سے کیا جا سکتا ہے؟

قاسم یعقوب: دیکھیں تقابلی فضا پر ادیب کے ہاں موجود رہتی ہے۔ البتہ اس تقابلی فضا کا دائرہ کار اور تناظر مختلف ہو سکتا ہے۔ مختار مسعود کے موضوعات ہمیں افسانوی و غیر افسانوی نثر دونوں اعتبار سے دکھائی دیتے ہیں۔ میرے نزدیک مولانا عبد الکلام آزاد نے جس سیاسی و تاریخی منظر نامے پر کھل کر لکھا ہے اس کے اثرات ہمیں مختار مسعود کی نثر میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے دور میں تاریخی اعتبار سے عبد اللہ حسین، جمیلہ ہاشمی، انتظار حسین جیسے جدید نثر نگاروں نے کافی لکھا ہے۔

علی حسن: تحقیقی مقالے کے تناظر میں چند اہم باتیں جو میرے تحقیقی سفر میں میرے لیے سود مند ثابت ہو، بیان کریں۔

قاسم یعقوب: علی! آپ میرے اچھے طالب علموں میں شمار ہوتے ہیں جو ادب کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ سمجھنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ تحقیقی مقالے کا دائرہ کار محدود ہوتا ہے۔ چند قواعد و ضوابط اور شرائط کے اندر رہتے ہوئے یہ معیارات پورے کیے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں آپ کا گہرا مشاہدہ اور مطالعہ خاص کر تاریخیت کے حوالے سے ہونا ضروری ہے۔ اگر تاریخیت کے بنیادی مباحث تک آپ کی ذہنی و فکری رسائی ہو جاتی ہے تو آپ یہ تحقیقی سفر بخوبی طے کر سکتے ہیں۔ سیاسی و سماجی شعور، عصری آگہی اور ثقافتی اعتبار سے مباحث کا تہذیبی نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش بھی کریں۔ باقی آپ کے لیے بہت دعائیں۔

علی حسن: سر! آپ کا بے حد ممنون و شکر گُزار ہوں۔

قاسم یعقوب: جی بہت شکریہ!

انٹرویو: ڈاکٹر روف پاریکھ

(ڈائریکٹر جنرل، ادارہ فروغِ قومی زبان اردو، پاکستان)

علی حسن: السلام علیکم!

ڈاکٹر صاحب: وعلیکم السلام!

علی حسن: اُستادِ محترم آپ کا انتہائی شکر گُزار ہوں کے آپ نے مصروفیات کے باوجود مجھے وقت دیا۔

ڈاکٹر صاحب: جی بیٹا! آپ کا موضوعِ تحقیق کیا ہے؟

علی حسن: سر! میرا موضوعِ تحقیق مختار مسعود کی اُردو نثر کا مطالعہ تاریخیت کے تناظر میں ہے۔ جس حوالے سے میں آپ کا انٹرویو کرنے حاضر ہوا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب: اچھا! فرمایئے کیا پوچھنا چاہتے ہیں، بہر حال آپ کو میرے مضامین حوالے سے پہلے پڑھنے چاہیے تھے کیونکہ میں کئی مضامین مختار مسعود کے حوالے سے قلمبند کر چُکا ہوں۔

علی حسن: مختار مسعود کی کُتب کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

ڈاکٹر صاحب: فرانسس بیکن کے بقول "کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں، جنہیں صرف چکھنا چاہیے، باقی کو نگل لینا چاہیے، لیکن چند ایسی ہوتی ہیں جن کو اچھی طرح چبا کر ہضم کرنا چاہیے۔ مختار مسعود کی کتابوں کا شمار بھی ان کتابوں میں کیا جانا چاہیے جنہیں خوب اچھی طرح پڑھ کر جزوِ ذہن بنانا چاہیے۔

علی حسن: اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہنے کے ساتھ ساتھ مختار مسعود کی علمی و ادبی شخصیت کیسے پروان چڑھی؟

ڈاکٹر صاحب: مختار مسعود کا شمار اُردو کے اُن ادیبوں میں ہوتا ہے جنہیں صاحبِ طرز کہا جاتا ہے۔ میر امن دہلوی، رجب علی بیگ سرور، مرزا غالب، جدید دور میں مشتاق احمد یوسفی، جمیل جالبی اور مختار مسعود۔ البتہ

مختار مسعود کا معاملہ ایک اور لحاظ سے بھی منفرد ہے۔ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک بڑے سرکاری افسر بھی تھے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہنے میں ان کی دیانت داری اور اُصول پسندی مثالی تھی۔ کبھی یہ غلط کام کرتے تھے نہ اُصولوں پر کوئی سمجھوتا کرتے۔ یہ دیانت داری ان کی علمی و ادبی شخصیت کو نکھارتی ہے۔

علی حسن: قیامِ پاکستان کے تناظر میں مختار مسعود کی تحریروں میں کیا اثرات دکھائی دیتے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب: مختار مسعود کا محبوب پاکستان تھا۔ آوازِ دوست ان کے اپنے دل کی بھی آواز ہے۔ اور ان کے محبوب کی بھی، اس آواز کی تعبیر اور تفسیر اسی وقت ممکن ہے، جب آپ نے بھی کسی سے، وطن سے، محبت کی ہو اور محب و صادق کے جذبہ صادق میں جزوی طور پر ہی سہی شریک ہوں۔ ورنہ یہ صدا آپ کی بھی سماعت سے ٹکرا کر لوٹ جائے گی اور دل تک نہ پہنچ پائے گی، اسی طرح جس طرح کئی نام نہاد دانش وروں کے لیے اس کی تفہیم ممکن نہیں ہوئی۔

علی حسن: مختار مسعود کے تاریخی شعور کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

ڈاکٹر صاحب: مختار مسعود کی بیشتر تحریروں میں تاریخی شعور ملتا ہے۔ ان کی کتاب "لوحِ ایام" میں تاریخی شعور بھی ہے، احساسِ قومی بھی، ملتِ اسلامیہ کا درد بھی۔ یہ کتاب اُردو میں انقلابِ ایران کے اہم ماخذات میں یوں شامل ہے کہ یہ ایک درد مند اور دیانت دار چشم دید گواہ کا بیان ہے۔ جسے اپنی قومی اور تاریخی ذمے داریوں کا بھی شعور ہے اور تاریخ کو بنتا دیکھنے کی اہمیت کا احساس بھی۔

علی حسن: سر! آپ کا بے حد ممنون و شکر گُزار ہوں آپ نے قیمتی وقت دیا۔

ڈاکٹر صاحب۔ جی! شکریہ سلامت رہیں۔

کتابیات

بنیادی مآخذ:

- مختار مسعود، آوازِ دوست، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار، لاہور، ۱۹۷۳ء
- مختار مسعود، سفر نصیب، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار، لاہور، ۱۹۸۱ء
- مختار مسعود، لوحِ ایام، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار، لاہور، ۱۹۹۶ء
- مختار مسعود، حرفِ شوق، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار، لاہور، ۲۰۱۷ء

- ### ثانوی مآخذ:

- ابوالاعجاز صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء
- امر شاھد، صاحبِ آوازِ دوست، بُک کارنر پبلیشرز، جہلم، پاکستان، ۲۰۱۷ء
- الطاف یوسف زئی، ڈاکٹر، مختار مسعود کا اسلوب، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، اشاعت سوم ۲۰۱۹ء
- انجم رحمانی، ڈاکٹر، پنجاب تمدنی و معاشرتی جائزہ، الفیصل پبلیشرز، اردو بازار لاہور، ۱۹۹۸ء
- انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، اشاعت نہم، ۲۰۱۵ء
- جمیل جالبی، پاکستانی کلچر (قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ)، مشتاق بک ڈپو، کراچی، ۱۹۶۴ء
- خلیق انجم، ڈاکٹر، متنی تنقید، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۴ء
- سبطِ حسن، ڈاکٹر، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال، ۲۰۱۷ء
- سبطِ حسن، ڈاکٹر، انقلابِ ایران، مکتبہ دانیال، ۲۰۱۷ء
- سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء
- شمیم حنفی، ڈاکٹر، تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء
- شہید صفی پوری، ایران کا اسلامی انقلاب اور اس کا ردِ عمل، کازوے بک سنٹر، دہلی ۱۹۹۶ء

- ۱۳۔ صادق علی گِل، ڈاکٹر، فنِ تاریخ نویسی، ایمپوریم پبلیشرز، اُردو بازار لاہور، ۱۹۹۸ء
- ۱۴۔ نسیم عباس احمر، ڈاکٹر، نو تاریخیت (منتخب اُردو مقالات)، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء
- ۱۵۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، جدید اور مابعد جدید تنقید، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۴ء
- ۱۶۔ ناہید قمر، ڈاکٹر، اُردو ادب میں تاریخیت، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء
- ۱۷۔ محمد زکریا، خواجہ ڈاکٹر، اکبر الہ آبادی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء
- ۱۸۔ ممتاز حسین، پروفیسر، ادبی تخلیقات میں تاریخی شعور، ادارہ نقدِ ادب، کراچی، ۱۹۹۸ء
- ۱۹۔ وہاب اشرفی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

اخبارات ورسائل:

- خرم سہیل، تاریخ کا چشم دید گواہ، مختار مسعود، روزنامہ نوائے وقت، اسلام آباد، ۱۵، مئی ۲۰۱۷ء
- روف پاریکھ، ڈاکٹر، لوحِ ایام پر نقشِ آوازِ دوست کا سفر نصیب ہوا، روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۹، اپریل، ۲۰۱۷ء
- علی عباس جلال پوری، ڈاکٹر، روحِ عصر، فنون، لاہور، شمارہ مئی جون، ۱۹۶۵ء
- قمر عباس، ڈاکٹر، آوازِ دوست اور مختار مسعود (سنڈے میگزین)، روزنامہ جنگ، راولپنڈی ۲۶، اگست، ۲۰۱۸ء
- 5.Encyclopedia of Philosophy, Vol 3 and Vol 5 New Yourk Macmillan 1978

انٹرویوز:

- منزہ احتشام گوندل، ڈاکٹر، انٹرویو بذریعہ ملاقات بابت، مورخہ ۱۲، جنوری ۲۰۲۱ء
- قاسم یعقوب، ڈاکٹر، انٹرویو بذریعہ ملاقات بابت، مورخہ ۲۵ جنوری، ۲۰۲۱ء
- روف پاریکھ، ڈاکٹر، انٹرویو بذریعہ ملاقات بابت، مورخہ ۲۰ مارچ، ۲۰۲۱ء